باب چہارم

🕮 احمد ندیم قاسمی کے قیامِ پاکستان کے مابعد کے افسانوی مجموعوں کا تانیثی مطالعہ

- ❖ آس پاس
- ❖ درودیوار
- ❖ سناٹا
- ❖ بازارِ حیات
- ❖ برگِ حنا
- ❖ گھر سے گھر تک
- ❖ کپاس کا پھول
- ❖ نیلا پتھر
- ❖ کوہِ پیما

احمد ندیم قاسمی فکری اور فنی لحاظ سے متنوّع شخصیت کے حامل ہیں۔ افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ شاعر، نقاد اور دانش ور کی حیثیت سے بھی انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ اپنے افسانہ نگاری کے پچپن سالہ دور میں اُنھوں نے افسانے کو مختلف ذائقوں سے رُوشناس کرایا۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اُن کی ذہنی تشکیل میں مارکسزم نمایاں ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کی حقیقت کے اِدراک اور اُسے بیان کرنے میں اُنھوں نے بخیلی سے کام نہیں لیا۔ پریم چند کی طرح اُن کی کہانیوں کا خمیر گاؤں کی مٹی سے اُٹھایا گیا ہے، اس لیے اُن کا تخیّل نازک، پُر لطف اور جمال آفرین ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا تعلق ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں سے ہے۔ اُنھوں نے حقیقت نگاری سے استفادہ کیا۔ اُن کے افسانوں میں ہمیں دیہاتی زندگی کے مُرقّع نظر آتے ہیں۔ خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کے پیڑ، پودے، دریا، چشمے، حجرے، پہاڑیاں اور ریگستان۔۔۔۔ اسی طرح گرمی، سردی، بہار خزاں اور برسات اور زمین و آسمان جانور، پرندے، یہاں بسنے والوں کے رہن سہن، طرزِ حیات، زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط۔۔۔ اُن کے مناظر کا حصہ بنے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے افسانوں میں شہری مناظر نہیں ہیں۔ اُنھوں نے دیہاتوں کے ساتھ شہروں میں رائج برائیوں اور مسائل کو اُجاگر کرنے اور ماحول کو صاف سُتھرا بنانے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی زندگی کا فطری خاکہ کھینچا ہے۔ اُن کے ہاں تصنّع کا شائبہ تک نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی ایک بلند پایہ ادیب ہیں۔ بڑا ادیب ماحول کی ہر برائی، ظلم، ناانصافی، غربت، افلاس، عدم مساوات اور عصری مسائل پر لکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے تمام عصری مسائل پر خامہ فرسائی کے ساتھ ساتھ عورت اور اس سے جُڑے مسائل پر بھی لکھا ہے۔ اُن کی تحریروں میں جابجا تانثیت کے عناصر بکھرے نظر آتے ہیں۔

تانثیت:

تانثیت ایک اصطلاح ہے جس کے مختلف معنی، مسائل، تصورات اور زاویے ہیں۔ اُردو ادب کے عہد میں ادیبوں نے غالب مرد معاشرے پر محض طنز نہیں کیا بلکہ نفسیاتی دباؤ، معاشی اور جنسی استحصال، خوف، جبر اور دہشت کے ماحول کو فنکارانہ ڈھنگ سے اُجاگر کیا ہے۔

حقوق نسواں یا فیمینزم کی جدوجہد میں ترقی پسند کمیونسٹ تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ ہیگل اور لینن نے عورت کی محکومی اور مظلومیت کے بارے میں ایک جامع تحقیق پیش کی کہ کس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے عورتوں کی آزادی کو غلامی میں بدل دیا ہے ۔لینن کی Origion of fan,lyand state نے عورتوں کا شعور اُجاگر کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ڈاکٹر فرزانہ کوکب کہتی ہیں:

"معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام فیمینزم ہے۔"(۱)

بیسویں صدی کے اواخر میں اردو ادب میں تانیثیت مباحث اہم گردانے گئے اور تانیثیت کو باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر برتا گیا۔ اس سے پہلے ترقی پسند تحریک نے عورت کے حوالے سے شعور ذات کا احساس دلایا۔ڈاکٹر رشید جہاں اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار کا نام اس لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ اُنھوں نے "انگارے" کی اشاعت کے ذریعے مردوں کی اس دنیا میں عورت کا نقطہ نظر پیش کیا۔اس کے بعد عصمت چغتائی کا نام ان کے مقلدین میں شامل ہے۔ عصمت چغتائی نے سب سے پہلے خاتون ادیبوں کو عورت پن محسوس کرنا اور اس کے احساسات کو پوری دیانت داری کے ساتھ قلم بند کرنا سکھایا۔عصمت چغتائی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"مغربی عورت یا مشرقی عورت اگر وہ جوتے کھاتی ہے اور چوں نہیں کرتی تو اس کے وجود پر رحم نہیں بلکہ غصہ آتا ہے۔ عورت کو نسوانیت کا پوگلا پیچ چوراہے پٹخنا ہوگا۔نسوانیت سے میرا مطلب ہے دنیا کا خوف ،بدنامی کا ڈر ،لاحول ولا قوۃ سب پھندے ہیں جو عورت خود مختار ہو وہ کسی طرح مرد سے کم نہیں رہتی۔"(۲)

ہیگل(۱۷۷۰-۱۸۳۱ء) ایک جرمن فلسفی تھا۔ ہیگل ایک متنازعہ شخصیت رہا ہے لیکن مغربی فلسفہ میں اس کی علمی قدرو قامت تسلیم شدہ ہے۔فلسفہ، منطق، تاریخ،جمالیات، مذہب،ماوراء الطبیعیات، علمیات اور سیاسی فلسفہ ان کے موضوعات ہیں۔

لینن: ولادیمیر لینن ایک روسی کمیونسٹ، انقلابی اور بالشویک پارٹی کے سربراہ تھے جو ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے دوران نمایاں ہوئے۔بالشویک بعد میں ایک کمیونسٹ پارٹی بن گئی۔ لینن یو دیت کا یونین لیڈر بنا جو دنیا کی پہلی کمیونسٹ ریاست تھی۔

روزِ اوّل سے معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں عورت، مرد کے ساتھ شانہ بشانہ چلتی رہی ہے لیکن مرد نے اسے کبھی بھی برابری کا درجہ نہیں دیا۔ مرد نے لاشعوری طور پر عورت کو احساس کمتری میں مُبتلا کیا اور اس پر بالا دستی اور برتری قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل نے تفریق کی دیوار کو اونچا کیا۔ عورت تحمّل اور اطاعت و فرماں برداری کا ثبوت دیتی رہی کہ کبھی تو حالات بدلیں گے۔ وقت بیتا لیکن مزاج، نیت اور فطرت نہ بدلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائے کی طرح ساتھ چلنے والی شریک سفر ذہنی طور پر دور ہوتی چلی گئی۔ اضطرار کی نیست نے رفتہ رفتہ اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا جس کے سبب بچوں کی تربیت اور پرورش میں جنسی تفریق اور منفی امتیاز کے مراحل تیزی سے طے ہوتے چلے گئے۔ صدیوں بعد جب اس جانب توجہ کی گئی تو ردِ عمل نے باغیانہ شکل اختیار کر لی جسے ادبی زبان میں تانثیت کا نام دیا گیا۔ عالمی ادب میں تانثیت ایک ادبی نظریے کے طور پر روشناس ہوا ہے جس کے سروکار مختلف سطحوں پر عورتوں کے تشخص اور گوناگوں مسائل رہے ہیں۔ ہر ملک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں اسکے وجود میں آنے کا سبب مرادنہ معاشرے کے خلاف بیزاری اور احتجاج ہے۔ دو سال پہلے مغرب میں اُٹھنے والے اس ادبی نظریے نے جلد ہی باضابطہ طور پر تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ تانثیت کی تحریک نے مراعات کی بجائے حقوقِ نسواں کے حصول پر اصرار اور مردانہ بالا دستی کے خلاف پُر زور احتجاج کیا۔ بیسویں صدی میں اس تحریک نے اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کرانے شروع کیے۔ اپنے اندازِ فکر اور لب و لہجہ کی بدولت ہندوستانی معاشرے میں عورت کا استحصال، بے بسی و بے چارگی کا احساس، معاشرے میں پائے جانے والے منفی امتیازات، مرد کے صبر و استبداد کے لاحق استحصال کے نتیجے میں عورت کی مظلومیت اور بحیثیت فرد اس کے حقوق سے معاشرے کا برتا جانے والا اغماض ہمیشہ سے ادباء کو اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ شاعری میں ادا جعفری سے پروین شاکر تک اور نثر میں عصمت چغتائی سے شائستہ فاخری تک خواتین قلم کاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے تانثیت کے حوالے سے مؤثر لہجے میں مکالمہ قائم کیا ہے۔ پروفیسر صغیر ابراہیم کہتے ہیں:

> ”دراصل تانثیت ان افکار و نظریات کا مجموعی اظہار ہے جو خواتین کو عزت و وقار کے ساتھ اُن کے حقوق کو یقینی بناتا ہو۔“(۳)

حساس افراد نے ہر دور میں عورتوں کے استحصال کے خلاف نعرہ بلند کیا ہے۔ مگر تانیثی شناخت کے بڑھتے شعور نے مرد و زن کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ سماجی سطح پر عورت کا جھگڑا مرد سے نہیں بلکہ پدر سری معاشرے کے اُن رویّوں، اقدار اور

نظریات سے ہے جنھوں نے عورت کو محکوم و مجبور بنا دیا ہے۔ روشن دماغ مرد قلم کاروں نے خواتین پر ہونے والے ظلم و جبر پر شدت اور اخلاص سے لکھا ہے لیکن اُن کو اتنے مؤثر انداز میں پیش نہیں کیا جا سکا، جن کی وہ مستحق ہیں۔

اردو میں تانیثیت کی روایت، تانیثیت کے عالمی منظر نامہ کا ایک اہم حصہ ہے۔ سر سید کے معاصرین میں ڈپٹی نذیر احمد بہو بیٹی نسواں کے لیے اپنی علمی و ادبی کاوشوں کی بدولت معروف تھے۔ سر سید اور علی گڑھ تحریک سے جُڑی معروف شخصیات تعلیم اور بہو بیٹی نسواں کے مسائل میں انتہائی حساس لُدّیہ رکھتی تھیں۔ حالی کی نظمیں اور راشد الخیری کا رسالہ "عصمت" بھی صنفِ نازک کے مسائل تیئں مردوں کے حساس روّیے کا پتہ دیتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے قیامِ پاکستان کے مابعد کے افسانوی مجموعوں کا تانیثی مطالعہ:

احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے علم بردار تھے۔ اُنھوں نے اپنے فن پاروں میں باقی موضوعات کے ساتھ ساتھ صنفی امتیازات اور حقوق میں عدم مساوات جیسے موضوع کو جگہ دی۔ اُنھوں نے بتایا کہ عورت جب تک اپنی حیثیت خود تسلیم نہیں کرے گی اور اسی معاشرے کے جبر و استبداد کے سامنے سینہ سپر نہیں ہو گی۔ تب تک معاشرہ اسے برابری کی سطح پر اس کا وجود تسلیم کرنے سے انکاری رہے گا۔ احمد ندیم قاسمی کے فنی سفر کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں پریم چند کا سفر ختم ہوتا ہے اور احمد ندیم قاسمی نے رومانی حقیقت نگاری اور ترقی پسند حقیقت نگاری کے اسالیب میں یادگار افسانے لکھنے کے بعد اس اسلوب میں کمال حاصل کیا، جسے خود اُنھوں نے صداقت پسندی کے نام سے موسوم کیا۔ گذشتہ پونی صدی سے پاکستان کا دیہی اور شہری معاشرہ جس سماجی اور تہذیبی انتشار سے دوچار ہے اور اس انتشار کے باعث ہمارے جذباتی اور رومانی رشتوں میں شکست و ریخت کا جو بھیانک عمل جاری ہے، اس کی ترجمانی اور تنقید کا فریضہ احمد ندیم قاسمی نے اس انداز میں کیا ہے کہ جہاں زمانۂ حال کا اقتصادی اور تانیثی استحصال بے نقاب ہو گیا ہے، وہاں ماضی کی زندہ روایات کے سہارے تعمیر نو کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔ احساس کی سچائی کے بغیر ادب میں جان نہیں آ سکتی اور زندگی کی رفتار کو اپنے تجربے اور شعور کے آئینے میں دیکھے بغیر ،بیان، واقعہ نہیں بن سکتا۔ احمد ندیم قاسمی میں یہی سچائی اور اس کی طرف یہی انسانی میلان ہے جس نے ان کے فن افسانہ نگاری کو ہر لمحہ روشنی اور توانائی بخشی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے اور اُن کا فن ایک

مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ اُن کے ابتدائی اور بعد کے دور کے افسانوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مقصد کا اظہار برملا ہوتا تھا، اب فنی تقاضوں کے تحت سامنے آتا ہے۔ اُن کے افسانوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ سب افسانے ایک سطح اور معیار کے نہیں ہیں۔ کسی بھی قلم کار کے ہاں ایسا ہونا ممکن بھی نہیں، لیکن اُن کا کوئی ایک بھی ایسا افسانہ نہیں ہے جسے محض فنِ نگارش کی کرشمہ سازی کہا جائے۔ ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی تجربے یا حادثے پر کی گئی ہے جو انسان کو بہت دیر تک اور بہت دُور تک متاثر کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کی کہانی سے واقفیت براہِ راست ہے۔ حقیقت کو تخیل کے ساتھ جوڑ کر افسانے کی بنیاد کھڑی کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے زیادہ تر متوسط اور نچلے طبقے کی زندگی کو عنوان بنا کر انسانی محرکات کا مطالعہ بے ساختگی کے ساتھ کیا ہے۔

آس پاس:

افسانوی مجموعہ "آس پاس" قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس میں آٹھ افسانے ہیں۔ اکیلی، بھری دنیا، افق، کرن، موت، تکمیل، ارتقاء، چڑیل۔ اس مجموعے میں افسانہ "اکیلی" تانثیت پر پورا اُترتا ہے لڑکی کا نام "خانی" ہے اس کے چھوٹے بھائی کا نام جچّو ہے۔ باپ مرتے دم خانی سے کہتا ہے کہ خاندانی عزت کی لاج رکھنا۔ خانی جوان ہے اور اُس کے پاس اُمنگوں بھرا دل ہے۔ اُس کا دل کرتا ہے کہ وہ کسی سے یا کوئی اُس سے محبت کرے۔ کسی کے نام پہ اُس کے کان کی لوئیں سُرخ ہوں۔ اُسے اکیلا پن محسوس ہوتا ہے لیکن باپ کی کہی بات کی لاج رکھنے کے لیے وہ خود کو مجبور پاتی ہے۔ ملک اسم کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکتا ہے۔ ایک دن وہ بارش کا بہانہ بنا کر اصطبل میں بارش سے بچنے کے لیے چلی جاتی ہے۔ دونوں جذبات کی رَو میں بہ کر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ خانی کو اپنا خاندانی وقار یاد آ جاتا ہے اور وہ وہاں سے خود کو چُھڑا کر بھاگ آتی ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اکثر ایسی سہل باتیں کرتی ہے کہ وہ گھبرا جاتا ہے۔ کہ خانی کیا کہ رہی ہے۔ بھائی کو پری کی کہانی سُناتے ہوئے کہتی ہے:

> "خانی کی آنکھوں میں بُجھتے ہوئے تارے جھلملا اُٹھتے "وہ اسی گاڑی میں اُترتی تاکہ کسی عمر بھر کے ساتھ کی تلاش کرے مگر اسے وہ ساتھی نہ مل سکا۔ اُسے جو بھی ملا، اس کے دل کا ایک حصہ گلا ہوا تھا۔ کوئی

بہت بھوکا تھاتو کوئی بہت امیر، کوئی بہت آوارہ تھاتو کوئی بہت نیک۔۔۔اسے کوئی ایساساتھی نہ مل سکا جس کا دل، داغوں سے پاک ہوتا۔"(۴)

اس افسانے میں ہمارے دیہاتوں کے رسم ورواج، سفید پوشوں کا رہن سہن، زندگی کا قیمتی اثاثہ عزت، چادراور چاردیواری کو موضوع بناکر "خانی" کے کرادر کے ذریعے صورت حال کوواضح کیاگیاہے۔

اس مجموعے میں ایک افسانہ "بھری دُنیا" ہے۔"بھری دنیا" میں راوی اکیلے پن کا شکار ہے۔ اپنے اکیلے پن میں وہ اپنی زندگی میں ملی کئی عورتوں کو اپنے ذہنی اُفق پر یاد کے ذریعے زندہ کر کے اپناوقت کاٹتاہے۔ کبھی اُسے اپنے دفتر میں کام کرنے والے کلرک کی حسین بیوی یاد آتی ہے، تو کبھی افسانہ نگار، کبھی چائے خانے میں رقص کرتی۔ رقاصہ اُس کے ذہن پر چھا جاتی ہے، تو کبھی جنگ کے دوران کام آجانے والی فوجی کی بیوہ اُس کے حواسوں پر چھاجاتی ہے۔

"مجھے معلوم ہوا کہ تم اس گاؤں کی سب سے فراخ دل حسینہ ہو۔ تمھارانوجوان خاوند لیبیا کے محاظ پر مر چکاہے اور تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو، جس کی چاردیواری پست ہے اور جس کے دروازے کی زنجیر محض چھونے سے کھل جاتی ہے۔تم شام کے بعد فوجی سپاہیوں کے پیش کیے ہوئے خم قم کے عطر لگاتی ہو۔۔۔۔۔تم نے میرے جیبوں کی تلاشی لی اور سات روپے سواسات کرنے نکال کر تکیے تلے رکھ لیے اور پھر تم نے میری سگریٹ کی ڈبیا اور رومال اور میرے ایک دوست کی تصویر بھی نکال لی۔ تمھاری محبت سستی اور تمھارا بستر میلا تھا مگر تمھاری بیباک ہستی اور چمکتی ہوئی آنکھوں نے مجھے بتایا کہ اگلے لوگ عورت کے متعلق نہایت محدود معلومات رکھتے تھے۔وہ عورت کی حیا کواس کے حسن پر غالب سمجھتے تھے اور تم حیاکے احساس سے یکسر عاری تھی۔"(۵)

راوی بتاتاہے کہ برما کے محاذ سے کچھ سپاہی ۲۸ دن کی چھٹی آئے تھے تو ایک رات تمھارے دروازے کی زنجیر میرے لیے "ہندوستان کے آئینی تعطل" کی صورت اختیار کرگئی۔افسانے میں جنس اور نفسیات کوبیک وقت بھرتا گیاہے۔راوی کہتاہے کہ تم میری یاد سے کافی عرصہ محور رہی ہو کیونکہ تمھیں خریدا جاسکتاہے۔ایک عورت کو کب خریدا جاسکتاہے؟جب جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اُس کے پاس متبادل ذرائع نہیں ہوتے، جن سے کام ودہن کا سلسلہ برقرار رکھا جاسکے۔یہ زندگی کا بد نما چہرا ہے، جس سے آنکھیں چُرائی نہیں جاسکتیں۔انسانی زندگی میں بہت سے ناپسندیدہ تعلق صرف اس لیے برقرار رکھنا پڑتے

ہیں کہ آمدنی کا کوئی مناسب ذریعہ دستیاب نہیں ہوتا۔ اسی مجموعے میں ایک افسانہ "کِرن" ہے، جس میں مرکزی کردار "شمسو" نازو نعم میں پلی ہے جبکہ اس کا چچازاد بھائی دوسری جنگِ عظیم میں شرکت کے بعد گھر واپس آ گیا ہے اور شادی کا خواہش مند ہے۔ دونوں کی بچپن میں ہی منگنی ہو گئی تھی۔ اب شہباز کے واپس آنے پر شمسو کا والد نہ چاہنے کے باوجود اپنی زبان کی وجہ سے مجبور ہے جبکہ شمسو کی ماں کُھل کر مخالفت کرتی ہے۔ کسی بیماری کی وجہ سے شہباز میں اب وہ ہمت نہیں جو نوجوانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ لڑکپن میں جب شہباز شہر جانے لگتا ہے تو اُسے اپنا بال دیتی ہے کہ اسے جب دھواں دو گے تو میں تمھارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تازہ ترین صورت حال میں شمسو کا باپ گردن کٹا دینے کو تیار ہے لیکن اپنے قول سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اُسے اپنی بات کا تو خیال ہے لیکن اپنی بیٹی کی خوشیاں عزیز نہیں۔

> "اور شہباز کو اس کی ضرورت محض اس لیے تھی کہ اس کا چولھا مُدتوں سے ٹھنڈا تھا اس کے ماں باپ مر چکے تھے، بہن پردیس میں بیائی جا چکی تھی اور سرکار سے اُسے آٹھ آنے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر شہباز جنگ پر جانے سے پہلے بڑا بانکا، سجیلا، سوھنا گھبرو تو کیا ہوا اب تو اس کی ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو وہ دیر تک مزے سے بیٹھی پَر سنوارتی رہتی ہے اور شہباز میاں میں ہاتھ ہلانے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔"(۶)

روزِ ازل سے مرد کی برتری کے سبب عورت کو ہی قربانی دینا پڑتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے موضوعات دراصل وہ سماجی ناہمواریاں ہیں، جن کا سامنا ہمیں قدم بہ قدم کرنا پڑتا ہے۔ اُنھوں نے افسانے کو سستے پراپیگنڈے کا آلہ کار بننے نہیں دیا بلکہ زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لیے استعمال کیا۔

اس مجموعے میں ایک افسانہ "چڑیل" ہے دراصل یہ ایک نوجوان مجذوب لڑکی ہے جو پہاڑیوں پر گھومتی پھرتی ہے اور چقماق کھا کر گزارا کرتی ہے۔ ایک رات گڈریے نے بادلوں کی آنکھ مچولی کے دوران اُسے دیکھا تو "چڑیل چڑیل" پکارتا گاؤں کی طرف آیا ۔ گاؤں والوں نے قرآن خوانی کرائی، دم کیے ہوئے پانی کا گھروں میں چھڑکاؤ کیا، دھونیاں دیں اور گویا خود کو محفوظ کر لیا۔ مراد نے کہا کہ وہ چڑیل نہیں، لیکن گاؤں والوں نے سینہ در سینہ چلتی کہانیوں میں اپنی طرف سے کچھ اضافے کر کے دُہرایا اور کہا کہ سکندرِ اعظم کے زمانے میں کالی ڈھیری کی چوٹی پر ایک ہندوستانی چڑیل نے ایک یونانی کی کھوپڑی توڑ کر اس کا گُودا نگل لیا تھا۔

جب سے اس ڈھیری پر کسی نے قدم نہیں رکھا اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ طوفانی راتوں میں ڈھیری پر چراغ جلتے ہیں، تالیاں بجتی ہیں اور ڈراؤنے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ مراد بضد رہا حتیٰ کہ اس نے اس کا حلیہ تک اُن کو بتایا جس کے مطابق اُس کا ماتھے پر بِندی ہے۔ جس کا نتیجہ جاہل لوگوں نے یہ لگایا کہ وہ ہندو چڑیل ہے نمبر دار کا بیٹا رحیم کالج میں پڑھتا ہے وہ تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"یہاں بنگال کے گلے سڑے ڈھانچے بھی ہیں اور بہار کے یتیم بھی ہیں اور سارے ہندوستان کی وہ بیوائیں بھی ہیں، جن کی آبرو کے رکھوالوں پر مشرق و مغرب کے میدانوں میں گدھوں، مچھلیوں اور کیڑوں نے ضیافتیں اُڑائیں اور اُن کے لہو کی پُھوار نے فاشزم کا فانوس بُجھا دیا اور جن کے خون کی جِدّت نے کئی کافوری سمتیں روشن کیں اور پھر ہندوستان میں تمھارے امر تسر، راولپنڈی اور مُلتان بھی تو ہیں، جہاں صرف اس لیے آبروریزی کی جارہی ہے کہ ان کے ماتھے پر نیلی بِندیا ہے۔"(۷)

احمد ندیم قاسمی انسانی فطرت کے اچھے فیض شناس ہیں۔ نقطہ آغاز، ارتقاء اور انجام۔۔۔ اُن کے افسانوں کا اختتام قابلِ غور ہوتا ہے۔ اس میں ایک ڈرامائی عنصر کی کافرونی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی "چڑیل" میں ہوا ہے۔ جب مراد دادا مولوی اور دوسرے لوگوں کو لے کر کالی ڈھیری پر جاتے ہیں تو وہاں چونکا دینے والا منظر سامنے ہوتا ہے۔

"آن کی آن میں ہجوم چوٹی پر جا پہنچا اور پھر یوں تھم گیا جیسے اس کے سامنے یکایک دیوار اُبھر آئی۔ سب کی آنکھیں پتھرا گئیں اور چہرے فق ہو گئے۔ سامنے مراد ایک روتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو بازوؤں میں اٹھاتے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا، "تم حیران ہو رہے ہو دادا؟ اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ یہ تو ایک نیا انسان ہے۔ پچھلے چیت کی حیوانیت نے اُسے جنم دیا ہے۔"(۸)

افسانہ چونکہ ناول کی طرح طویل نہیں ہوتا اسی لیے زیادہ تناسب اور قطع و چاہتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں تاثر اور تجربے کا بھرپور اور تشفّی بخش اظہار تمام ہو جائے، وہیں افسانہ ختم ہو جائے۔ یہ افسانے کو غیر فطری طُول دینے سے اُس کی وحدت تاثر کو نقصان پہنچتا ہے۔ آس پاس کے تمام افسانوں کے اختتام قابل غور ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تحریر اس وقت چمک اُٹھتی ہے جب وہ دیہات کے بے داغ حسن پر سے پردہ اُٹھاتے ہیں، وہ افسانے میں پیش کی گئی۔ نفسیاتی گرہیں، تانثیت، جذباتی کشمکش کو نمایاں

اور معتدل کرنے کے لیے فطرت کا سہارا لیتے ہیں۔ انسانی جذبات اور ذہنی گتھیوں کو تابناکی اس وقت ملتی ہے جب رومان کی ابتداء، ارتقاء اور انتہا اکثر فطری مظاہرے پس منظر میں دِکھائے جاتے ہیں۔ افسانہ ''چڑیل'' کے آخر میں بھی یہی دکھایا گیا ہے:

''دھرتی کی مانگ کا سیندور پھر سے چمک اٹھا ہے دادا۔۔۔ دادا مگر اس عورت کے ماتھے پر تو بندیا کا نشان تھا۔ نیچے سے مولوی جی نے ایک اعتراض اُچھالا اور مُراد پکارا''مگر بچے کا ماتھا تو چاند کا ٹکڑا ہے''۔ ''چڑیلوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں؟'' مولوی جی نے جیسے ساری دُنیا کو سرزنش کی۔ ہجوم ایک دم دادا کی قیادت میں رحیم سمیت نیچے کی طرف پلٹا اور مُراد انسانیت کی نئ نویلی امانت کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے پکارا۔''کیا تم میں سے ایک انسان کو اپنی دھرتی کی جنت میں بسا لے؟ اگر نہیں تو یاد رکھو کہ جنت سے نکالا ہوا انسان اپنی ایک نئ دھرتی اور ایک نئ جنت بسانے پر بھی قادر ہے۔''(۹)

احمد ندیم قاسمی نے نہایت غیر جانبداری کے ساتھ عورت کی تصویر کو پیش کیا ہے۔ ایک وہ عورت جو صحیح معنوں میں عورت کی شوخی، شرارت اور چنچل پن کر ظاہر کرتی ہے اور دوسری وہ جو زندگی کے مصائب اور تکالیف میں گھِری ہوئی ہے۔ انھوں نے عورت کو مظلوم دکھایا ہے اور اِس مظلومیت کے پیچھے معاشرہ، سماج، حالات، طبقاتی بغاوت اور معاشی عدم مساوات ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی عورت فعال نہیں ہے لیکن وہ ذہنی تجربات کی کئی دنیاؤں سے گُزرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں عورت اذیت اور جمود کا شکار ہے۔ گھٹن اور بے بسی کا شکار یہ عورت سورج کی نئ کرن کی منتظر ہے۔

درودیوار:

مجموعہ ''درو دیوار'' قیامِ پاکستان کے بعد چھپنے والا احمد ندیم قاسمی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اِسے مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا۔ اس میں اٹھ افسانے شامل ہیں۔ ''میں انسان ہوں''، ''نیا فرہاد''، ''تسکین''، ''جب بادل اوڑھے''، ''سپاہی بٹیا''، ''ووٹ''، ''کہانی لکھی جارہی ہے'' اور ''راجے مہاراجے'' کے علاوہ ایک ڈرامہ ''مصوّر'' بھی شامل ہے۔ ''راجے مہاراجے'' علامتی افسانہ ہے۔ ''کہانی لکھی جارہی ہے'' جاگیر دارانہ استحصال کی کہانی ہے۔

''آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے پلٹ کر چادر سے منھ ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا''فاطمہ! تم رو رہی ہو اور بیٹھے ہوئے چولے میں تمھاری پیٹھ ہنس رہی ہے۔''(۱۰)

صدیوں سے سرمایہ دار غریب کا جاگیر دار اپنے مزارعوں کا استحصال کرتے چلے آئے ہیں۔ ان غریبوں اور کسانوں میں ایک غالب تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ کہانی میں مسافر بچے سے پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ بچہ بتاتا ہے کہ سرمہ دانی۔ مسافر راز راہ تفنّن کہتا ہے کہ سرمہ لگانے سے جن عاشق ہو جاتے ہیں جس پر فاطمہ سنجیدگی سے کہتی ہے: "میں نے دن کو ہی لگایا تھا سرمہ۔ فاطمہ بولی اور جاگیر دار کے کھیت سے گھاس چرانے چلی گئی تھی" مندرجہ بالا دو سطریں کہانی کو واضح کرنے کے لیے کافی مددگار ہیں۔ فاطمہ اپنے بیٹے "چراغ" کہہ کر آواز دیتی ہے تو مسافر حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فاطمہ کے استفسار پر کہتا ہے:

> "بہت پیارا نام ہے۔ بڑا بامعنی ہے۔ نئی نسل کے بچوں کے نام ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ خادم اور غلام قسم کے ناموں سے بزدلی اور کمتری پیدا ہوتی ہے۔ چراغ میں روشنی ہے اور گرمی ہے، اور خوبصورتی۔ چراغ بڑا پیارا نام ہے۔"(۱۱)

درودیوار میں ایک کہانی "نیا فرہاد" ہے آزادی کی خون ریزی اور فسادات میں جعفر ایک ہندو لڑکی شانتی کو پسند کرنے لگتا ہے۔ ہنگاموں میں کوئی کہتا ہے شانتی میری ہے اور کوئی کہتا ہے نہیں یہ میری ہے۔ جعفر کو تیسرا گولیاں مارتا ہے جس سے وہ نیم مُردہ ہے۔

> "شانتی کو کوئی نہیں لے سکتا" ایک بار پھر اس کا جسم لرزا۔ نوجوان پھر ایک ساتھ ہنسے ہٹ جاؤ۔ ادھر تیسرے سے اُسے دھکا دیا اور شانتی کی طرف بڑھا اور شانتی باہیں پھیلا کر جعفر کی طرف بڑھی اور جعفر ایک مسحور انسان کی طرح شانتی کی طرف بڑھا، مگر شیر اپھر بیچ میں حائل ہو گیا اور شانتی کو بازو سے کھینچ کر لے جانے لگا "شانتی تمھاری نہیں" جعفر چلایا "تمھاری بھی نہیں" شیر اچلایا:
>
> "شانتی کسی کی بھی نہیں" جعفر نے نہایت سکون سے کہا۔۔۔۔ مرتی ہوئی شفق میں جعفر کا چُھرا ایک بُجھتے ہوئے شُعلے کی طرح لپکا اور شانتی کے پیٹ میں کروٹیں بدلتا ہوا دوسری طرف نکل کر اپنی نوک کو زمین میں ڈبو کر رہ گیا۔"(۱۲)

نسائی شعور کی بیداری کا اعلانیہ یہی تانیثی منشور ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور ان کے معاصر ادباء نے اپنی تحریروں میں واضح کرنے کی کوشش کی۔ دورِ حاضر کا تانیثی شعور بحیثیت انسان عورت کو تہذیبی، سماجی اور اقتصادی طور پر مردوں ہی کی طرح آزادیٔ

خیال اور ہمراہی کی وکالت کرتا ہے۔نفسیاتی دباؤ، معاشی اور جنسی استحصال اور نا آسودگی کا شکار خواتین مستقبل کے لیے معاشرے میں اچھے افراد کا اضافہ کرنے سے قاصر ہوں گی جہاں خوف، جبر اور دہشت کا ماحول ہو گا وہاں لازمی رشتوں اور اقدار کے غیر مساویانہ سلوک، شناخت، تشخص اور اناوغیرہ کا دور دورہ ہو گا۔ بے شک تانثیت مغرب کا دین ہے لیکن یہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہنے والی خاتون کی ضرورت ہے۔برصغیر کی عورت زیادہ مظلوم ہے جِس کی بنیادی وجہ جاگیر دارانہ نظام ، مذہب سے دوری توہّمات، جہالت اور رسومات ہیں۔ ابتدائی دور کے افسانوی ادب میں اس امر کی گواہی موجود ہے کہ ادباء نے ہر دور میں عورتوں کے حقوق کے لیے مقدور بھر آواز بلند کی اور معاشرے میں موجود تانیثی عناصر کی نشاندھی کی۔ احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری باقی مسائل کے ساتھ ساتھ تانیثی شعور پیدا کرنے کی شعوری کوشش ہے۔

سناٹا :

۱۹۵۲ء میں سناٹا شائع ہوا اسے نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا اس میں دس افسانے ہیں اب تک اس کے کئی ایڈیشن آچکے ہیں اس مجموعے میں احمد ندیم قاسمی کے شہرہ آفاق افسانے "کنجری"، "رئیس خانہ"، "الحمدللہ"، "آتشِ گل"، "گنڈاسا" اور "سناٹا" شامل ہیں۔ اس کا دیباچہ نقاد وقار عظیم نے لکھاہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مجموعے میں شروع سے آخر تک مارکسی نظریات کا گہرا اثر ہے اور دوسری طرف مذہبی اور اخلاقی رُجحانات کا جذباتی عکس۔ وہ جنس کو زندگی کا اہم تقاضا سمجھنے کے باوجود اس رُجحان کو حُسنِ اخلاق کے معیار کا پابند رکھتے ہیں۔ افسانہ "کنجری" اس رُجحان کا اہم افسانہ ہے۔ غربت سے زیادہ اس افسانے میں اس عمل کو واضح کیا گیاہے، جس کے ذریعے روح پر کثافت کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی اصل صورت پہچانی نہیں جاتی۔ سرور اور اُس کی ماں عرصے سے جِنس فروشی کا کاروبار چلاتے رہے ہیں۔ وہ دونوں کمالاں کو جس بے غیرتی کے ساتھ گُناہ کی دلدل میں دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے گِھن آنے لگتی ہے۔ کمال کی مدافعت بھی جس طرح رفتہ رفتہ کمزور پڑتی ہے، وہ بھی عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت پسندانہ بھی۔

"ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کُنڈی کھولنے کی کوشش کی "کل پھر ملیں گے میری جان!" اور آخر کمالاں بولی
"کل تو خیر ملیں گے، پر آج کی اُجرت کہاں ہے؟" "اُجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اُجرت مانگتی ہے

> "عاشقی کی اُجرت مانگتی ہے، شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا کنجری۔ اُس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نِکل گیا۔"(۱۳)

افسانہ "کنجری" لڑکی سے کنجری بننے تک کا سفر ہے۔ کمالاں کی دادی تاجی طوائف تھی مگر اس کی شادی "خان" کا خطاب ملے آدمی سہراب خان سے ہو گئی تھی۔ سرور کی پیدائش پر ملتان سے آئی۔ دائی، تاجی کو پہچان لیتی ہے اور محلے میں اُن کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ یوں تاجی اور سہراب غربت، شرمندگی اور فاقوں سے تنگ آکر فیصل آباد چلے جاتے ہیں۔ اس سال بعد سہراب انتقال کر جاتا ہے۔ تاجی گاؤں والوں کے منت ترلے کر کے دوبارہ گاؤں میں رہنے لگتی ہے اس پندرہ برس شرافت سے گُزارنے کے بعد سرور کی شادی ایک غریب لڑکی سے کر دیتی ہے مگر وہ لڑکی زچگی کے دوران کمالاں کو جنم دے کر مر جاتی ہے ۔ سرور ملتان چلا جاتا ہے پھر تاجی بھی کمالاں کو مولوی کی دہلیز پر ڈال کر بیٹے کے پاس چلی جاتی ہے یہ وہاں نشہ بیچتے ہیں پکڑے جانے اور جیل میں سال بھر قید رہے اور چھوٹنے کے بعد عصمت فروشی کا کاروبار شروع کرنے کا سوچتے ہیں اور اُنھیں اپنی کمالاں یاد آجاتی ہے۔ مولوی سے کمالاں واپس لے کر یہ اس کی ذہنیت تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ کمالاں مولوی کے گھر میں رہنے اور تربیت کی بدولت صوم صلوٰۃ کی اور اچھی عادات کی مالک ہے۔

> "اماں وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمین دار کے ساتھ بھاگ گئی، جس کے ۔۔۔ بڑھیا پیڑھی سمیت اچک کر سردار کے گھٹنے سے آٹکرائی۔ "بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے کو اور لعنت اس کے باپ پر، جو سکول کے روکھے سڑے، ٹوٹے جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔۔۔ واہ کس کے ساتھ بھاگی "بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے لہجے میں برابر پھونکیں مارے جارہی تھی۔"(۱۴)

افسانے کے آخر میں کمالاں غربت اور ناداری سے مجبور ہو کر اس راستے کی طرف بڑھتی ہے۔ جسے وہ شروع میں نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں ایک افسانہ "رئیس خانہ" ہے یہ ایک معرکے کا افسانہ ہے کے زیرِ اثر انسانی بے بسی کی ایک دلدسوز تصویر ہے جسے ندیم قاسمی نے ہُنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ رئیس خانے کے مادی اور طبعی وجود کو دلکش پسِ منظر اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی روشنی میں اُبھارا گیا ہے لیکن ہمارا اصل موضوع تانثیت ہے۔ پہاڑی میاں بیوی فضلو اور

مریاں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ یوسف رئیس خانے میں آکر ٹھہرتا ہے۔ اس افسانے میں یوسف جیسے رئیسوں کے فریب اور ریاکاری کے عکس کے ساتھ تحیّر کا عنصر بھی ہے کیونکہ آخر وقت تک یہ قیاص مشکل ہے کہ انجام کیا ہو گا۔

"دیکھو فضلو دوست! کیا اس شیکسپیئر پہاڑ پر کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں ہو گی جو میری راتیں آباد کر سکے؟ کوئی ایسی لڑکی نہیں ہو گی جو مجھ سے ایک سو روپے لے کر رات بھر میری زندگی کی جلی شاخ پر پھول بن کر مہکے اور صبح کو چلی جائے؟ کیا خدا کے ایک دُکھی بندے کی دنیا کو چند گھڑیوں کے لیے آباد کر کے تمھارا دل خوش نہیں ہو گا؟ فضلو تم گھبرا کیوں رہے ہو؟ تم تو ہانپ اور کانپ رہے ہو میں تمھیں ہر رات کے دس روپے دوں گا۔ میں مُفت خور نہیں ہوں، مجھ پر جوانی کا بھوت سوار ہوتا تو میں لاہور واپس جا کر ہیرامنڈی میں ڈیرے ڈال لیتا لیکن مجھے کاغذی پھول نہیں چاہئیں۔ مجھے سچ مچ کی ایک عورت چاہیے سچ مچ کی ایک عورت۔"(۱۵)

یوسف اپنی آواز میں رِقت پیدا کر کے جب یہ بات فضلو سے کہتا ہے تو فضلو ہاتھ چُھڑا کر کہتا ہے کہ میں غریب ضرور ہوں پر کنجر نہیں۔ لیکن یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرد شرافت اور دوسرا ضرورت کا پرچار کر رہا ہے لیکن وجہ نزاع پھر عورت ہی ہے کیا عورت کی اپنی کوئی مرضی نہیں، کوئی تشخص نہیں:

"ساری دنیا سو گئی تھی۔ صرف صاحب جاگ رہا تھا یا فضلو۔ صاحب کی جیب میں روپے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ فضلو کی جیب خالی تھی اور آنکھوں میں جلن تھی۔"(۱۶)

فضلو گاؤں کی ایک بے تکلف لڑکی بہشتو کے پاس رات گزارنے کے لیے راضی کرتا ہے۔

"رات صاحب کے پاس گزار وگی؟ سو روپے ملیں گے۔۔۔۔۔ سو ہی ملیں گے نا"؟"ہاں ہاں پورے سو۔ بھیّا کو خبر نہ ہو، "مجھے کیا پڑی ہے"۔۔۔ آہستہ بولو، "تم بھی آہستہ بولو"۔ کچھ دیر رُک کر وہ ذرا چکرائی اور بولی۔۔۔ مریاں نے کتنے لو کمائے ہیں" ایک دم جیسے آسمان ٹوٹ پڑا اور سکیسر بیٹھ گیا۔"(۱۷)

دیہاتوں کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی نے پہاڑوں پر آباد لوگوں کے رہن سہن، رویّوں، غربت، مشکلات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایسے عوامل کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

پاکستانی نقاد عزیز احمد آغا کہتے ہیں:

> "احمد ندیم قاسمی زندگی کے ایک زیرک ناظر ہیں اور ان کا فن زندگی کے ارضی پہلوؤں کا ایک خوبصورت عکس پیش کرتا ہے، لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تخیّل کی لطافت، رفعت اور ملائمت بھی ہمہ وقت قائم رہتی ہے۔"(۱۸)

فضلو اور مریاں افسانہ "رئیس خانہ" کے مرکزی کردار ہیں۔ اچھی زندگی گزارنے کی خاطر وہ میدان چھوڑ کر پہاڑی مقام کی طرف آتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر فضلو مسافر خانے میں ملازم ہے اور مریاں صفائی ستھرائی اور گھر کا کھانا وغیرہ بناتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے فن کی پختگی کے باعث مسافر خانے کا غریبوں کی نظر سے "رئیس خانہ" بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کہتے ہیں:

> "انسان کی نفسیات پر قاسمی کو خاصا عبور حاصل ہے۔ اُنھوں نے چھوٹے لوگوں کی خواہشات، ان کی تکمیل کی جستجو اور حیرت و حسرت کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔"(۱۹)

فضلو کو بڑی عمارتوں کے چوکیدار اور شاہانہ رہن سہن کے قصے سناتے تو فضلو تحیّر میں ڈوب جاتا۔ مریاں کو بتاتے تو وہ کہتی کہ ٹھیک ہے تو کہتے ہیں کہ ان کی بیویوں، بیٹوں کو تم نے دیکھا کہ ریشم پہن کے پٹالے کہ رانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے بڑی عمدگی کے ساتھ سماج کے اس طبقے کی نفسیات کو پیش کیا ہے اور اسی طرح فضلو اور مریاں کے کرداروں کی شخصیت سازی کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے قلم کو داد دینی چاہیے کہ فنکارانہ مہارت سے انھوں نے کلائمیکس تک اس بات کو اخفا میں رکھا ہے کہ یوسف کی نظر شروع سے فضلو کی بیوی مریاں پر ہے اور وہ اس کی قربت کا بُھوکا ہے۔ لیکن قاری کا ابلاغ دیر سے کُھلتا ہے کہ یوسف کا رئیس خانے میں وقت گزارنے کا اصل سبب کیا ہے۔ اُس کی بیوی شادی کے ایک مہینے بعد ہی ساون کے مہینے میں غیر طبعی موت کے سبب فوت ہو جاتی ہے۔ فضلو یوسف کو شریف انسان سمجھتا ہے۔ یہ افسانہ نفسیات کو بیان کرتا ہے۔ یوسف اپنے کردار، عمل، رویے سے فضلو کو اپنے دام میں کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ فضلو جیسے ایماندار، ہمدرد اور شریف لوگ

دوسروں کو کسی بھی قسم کی پریشانیوں میں نہیں دیکھ سکتے۔ فضلو لاکھ کوششوں کے باوجود بھی مریاں سے یہ بات نہیں کہہ پاتا کیونکہ مریاں صحت مند، قبول صورت اور اچھے کردار کی مالک لڑکی جو حق گوئی، بیباکی اور گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے والی لڑکی ہے۔ فضلو یوسف کے لیے تین عورتیں مہیا کرتا ہے لیکن عورتوں نے صاحب کے کچھ نہ کرنے اور محض دیکھنے پر اکتفا کرنے کو کہا۔ فضلو پر یوسف کی شرافت، مجبوری اور اضطرابی کیفیت کا سِکہ بیٹھ گیا اور پھر عزت دار مگر غریب اور عاقبت نااندیش انسان نے دنیا کی مکاری اور چالاکی سے بے خبر انسان نے وہ فیصلہ کرلیا جو عام دنوں میں اس کے لیے مرنے سے کم نہ تھا۔

"میں تو کہتا ہوں بہشتو کی جگہ پہلے دن سے تمھیں وہاں بٹھا دیتا تو کچھ ایسی خراب بات نہ تھی۔"(۲۰)

ہر ذی شعور یہاں یہ سوچتا ہے کہ اپنی ذہنی کیفیت، رویّے اور جذبات کی سُولی پر ایک مرد کیوں نہیں چڑھتا؟ فضلو اور یوسف دونوں مردوں کی مشکل حل کرنے کے لیے آخر مریاں ہی کیوں؟ ایک کو پیسے کی ضرورت ہے اور دوسرے کو جنس کی۔ حالانکہ مریاں، جس عورت کے لیے یہ معاملہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ شوہر کے منھ سے اس طرح کی بات سن کر اس پر بجلی سی گر گئی۔ لیکن شوہر کی ہر بات کو حکم تصور کرنے والی، مشرقی عورت کی طرح سوچنے والی مریاں خوشحال زندگی کا تصور کر کے بھی اپنے آپ کو سمجھا نہیں پاتی۔ مریاں کے لیے یہ عزت، غیرت اور آبرو کا سودا ہے تو دوسری طرف شوہر کی مرضی اور مستقبل کا خواب۔ اس کے باوجود بھی وہ اس گناہِ عظیم کے لیے خود کو تیار نہیں کر پا رہی جبکہ دوسری طرف فضلو کی نظر میں گناہ سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ ثواب کے ساتھ آمدنی کا ذریعہ بھی ہے:

"اچانک مریاں تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی،

"اگر تم ایسے ہی بیغیرت ہو گئے ہو تو ایک شرط ہے؟"

"بتاؤ"، فضلو بھی کھڑا ہو گیا،

"میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ اسی پر قائم رہو گے؟"

"پہلے شرط بتاؤ"۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا،

"میں رات صاحب کے پاس جاؤں گی، اگر اُس نے مجھے چھو لیا تو پھر۔۔۔

میں تمہاری نہیں رہوں گی، پھر جہاں چاہوں گی چلی جاؤں گی۔"

اس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہ تھا۔"(۲۱)

فضلو یوسف کے سابقہ تین عورتوں سے سلوک والے عمل سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اپنی بیوی کی خطرناک شرط کو بھی مان لیا۔ کہانی کا عروج یہ ہے کہ:

"اس نے مریاں کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو ایک مرد، عورت کے ساتھ کر سکتا ہے بلکہ مریاں میں اپنی مریم کو قید سنتا ہوا اس کی روح اور جسم کی ہر گزرگاہ پر بھٹکتا ہوا اس کے عالی شان، باعزت، باآبرو، مقدس جسم نما حویلی کے در و دیوار کو مسمار کرتا ہوا اور اسے کھنڈر میں تبدیل کرتا ہوا۔ وہ ہوا کے تیز جھونکوں کی مانند سکیسر کی پہاڑی سے یوں اُتر گیا جیسے یہی ایک کام کرنے کے لیے برسوں اور صدیوں سے منتظر تھا۔"(۲۲)

فضلو کے ساتھ ساتھ قاری بھی اچانک اندھیرے میں دیوار سے جا ٹکراتا ہے اور اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر قاری اور فضلو کی یہ کیفیت ہے تو مریاں؟ غصہ، غم، رنج، تحقیر اور تذلیل اور آنسوؤں کے درمیان وہ گھر چھوڑ کر پہاڑوں سے نیچے اترتی ہوئی بھاگتی ہے۔ فضلو اسی کے پیچھے بھاگتا ہے۔ دونوں لیٹ جاتے ہیں اور رونے لگتے ہیں۔ یہیں فضلو کہ موت واقع ہو جاتی ہے۔ مریاں نے جو کچھ کیا فضلو کے ایما اور مرضی سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے آخر میں مریاں کا کردار اپنی وسعت کے ساتھ پوری کائنات پر پھیل جاتا ہے اور مشرقی عورت کے کردار کو پختگی اور عمدگی سے پیش کرتا ہے۔

افسانہ" سناٹا" مجموعے کا مرکزی افسانہ ہے۔ یہ کلثوم کی کہانی ہے جو گھر کا واحد کفیل ہے۔ بھائی آزادی کے دوران کیمپنگ میں لڑکی سے عشق کرتا ہے اور ہوشیاری سے اپنی چالاک و مکار بیوی کو لے کر چلا جاتا ہے۔ گھر میں ماں کے علاوہ ایک بیوہ بہن ہے جس کے دو بچے بھی ہیں۔ دوسرے نمبر پر رضیہ ہے جسے مِرگی کے دورے پڑتے ہیں اور وہ ابنارمل ہے۔ کلثوم سکول میں فارسی اور ریاضی پڑھاتی ہے اور اس کی تنخواہ سے گھر چل رہا ہے۔ اس سے ایک چھوٹی بہن زہرہ بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے تو اس افسانے میں ایسا ہی ہوا ہے۔ "ناجو"، نجمہ ارشاد احمد بن کر ایک گھر کو چھوڑ کر پورے گھر پر قابض ہو جاتی ہے۔ بقول اُس کے:

"رانڈوں اور کنواروں کے پاس ایک سے زیادہ کمرہ ہو تو سمجھ لو دوسرا کمرہ گلچھرے اڑانے کو اڈہ ہے۔ کھُلے مکان تو بیاہتا عورتوں کو زیب دیتے ہیں۔"(۲۳)

چند روز بعد راشن مقرر کر دیا گیا۔ماں بیٹیوں نے کھُسر پھُسر کی آنسو بہائے جاتے رہے۔اس پہ بس نہ ہوئی، نجمہ نے لگائی بجھائی اور بہتان کا کام شروع کر دیا۔بے جاالزام تراشی پر مائیں، بیٹیاں جزِبز ہوئیں لیکن کیا کر سکتی تھیں۔یہ سلسلہ حد سے بڑھا۔نجمہ نے شوہر کو ماں بیٹیوں کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ماں نے بیٹے کی الزام تراشی پر کہا کہ بیٹا تجھے ذرا شرم نہیں آئی تو نجمہ نے ڈرامہ شروع کر دیا۔ارشاد نے بیوی کو کو کمرے میں پہنچایا اور ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا:

"نہیں اماں! مجھے تو ذرا بھی شرم نہیں آئی۔جس گھر میں لڑکیاں آنکھیں ماریں اور ننگی ہو کر ڈنٹر پیلیں، وہاں ایک لڑکے کو بھلا شرم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، سمجھیں آپ؟"(۲۴)

ماں وہ ہستی ہے جس کے پیروں تلے جنت ہے۔جسے ایک بار مسکرا کر دیکھنے سے حجِ اکبر کا ثواب ملتا ہے۔مرد چاہے شوہر ہو، باپ ہو یا بیٹا، عورت کا تحفظ ہوتا ہے۔اُسے کفیل بنایا گیا ہے۔جب وہ ایسی بات کہے گا تو عورت کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ارشاد اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو جاتا ہے۔کلثوم نے پورے گھر کا ذمہ اٹھایا۔۔۔۔۔زندگی چل رہی تھی کہ کلثوم کو سکول کے کلرک جمال کو چھٹی ملتی ہے۔کلثوم خیالوں ہی خیالوں میں واجبی شکل وصورت کے جمال کے ساتھ فلک تک ہو آتی ہے۔ماں کو پتہ چلتا ہے تو وہ اُسے بہت ڈانٹتی ہے کیونکہ اُسے یہ خطرہ ہے کہ اگر اس کی شادی ہو گئی تو گھر کا بوجھ کون اُٹھائے گا؟ یہاں ایک بار پھر ایک عورت دوسری عورت کا استحصال باقی عورتوں کے لیے کرتی ہے:

"اُنھوں نے اپنی آٹے بھری انگلی کو ناک پر رکھتے ہوئے کہا،

"شادی کا بھوت سوار ہوا ہے۔کبھی اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں؟ ہوں؟ دیکھی؟ یہ پھٹی پھٹی آنکھیں، یہ مردہ مردہ ہونٹ اور یہ چھاج سے کان۔جاؤ، آئینہ دیکھ کر آؤ اور پھر مجھ سے بات کرو۔ارے! وہ لفنگا تو تجھے دو چار دن استعمال کر کے پھٹے جوتے کی طرح کُوڑے پہ ڈال دے گا۔مجھ سے پوچھو اِن مردوں کے چلن۔تم نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے؟"(۲۵)

کلثوم اپنی ماں سے اس ہیئت کذائی کے بعد رونے لگتی ہے اور جبر کے کئی کڑے لمحوں کے گزرنے کے بعد کمرے میں جاکر زنجیر لگادیتی ہے اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگتی ہے:

"آئینے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو گھُورنے لگی۔ پھر اس کے ماتھے پر شکنیں پیدا ہوئیں۔ چہرے پر کراہیت کے سائے چھاگئے اور اس نے ہونٹوں کے کچھ ایسے زاویے بنائے جیسے آئینے پر تھُوک دیناچاہتی ہو۔"(۲۶)

کلثوم جمال کو کہہ دیتی ہے کہ میں مجبور ہوں تو گھر میں سب نارمل ہو جاتا ہے۔ کلثوم چھوٹی بہن زہرہ کے کمرے میں جاتی ہے۔ وہ کھُلی کتاب کو سینے پر رکھ کر سو رہی تھی:

"سو رہی ہو زہرہ؟ نہیں تو۔۔۔۔ زہرہ اُٹھ کر بیٹھی رو رہی تھی۔۔۔۔ میں بچی نہیں ہوں آپی! میں نادان نہیں ہوں۔ میں نے سب سُن لیا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ کسی اور گھر چلی جائیں گی اور پھر مہینوں بعد کبھی کبھار ہمارے ہاں آئیں گی اور یوں ہی بس ذرا سا مزاج پوچھ کر چلی جائیں گی اور آپ کو یہ تک معلوم نہیں ہو گا کہ کم بخت زہرہ اسکول کی فیس نہ دے سکی، اس لیے دسویں جماعت سے آگے نہ پڑھی۔ ہم بھلا آپ کے کون ہیں آپی؟۔۔۔ جایئے کر لیجیے شادی۔ ایک چھوڑیں دس شادیاں کر لیجیے"۔ زہرہ نے کتاب اُٹھا کر دیوار پر دے ماری اور روتی ہوئی ٹوٹی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔"(۲۷)

ایک لاچار، بے کس نوجوان لڑکی جو ، پہلے ہی تذبذب کا شکار ہے کہ سر پر نہ باپ ہے نہ بھائی۔۔۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟۔۔۔ اس صورتِ حال کو احمد ندیم قاسمی نے مہارت کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں عورت سے زبردستی سے اس طرح کی قربانیاں لی جاتی ہیں اور قصوروار بھی اُسے ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ "سناٹا" ایسی ہی صورتِ حال کا عکاس ہے:

"تین روز اُس کی یہی کیفیت رہی اور جب چوتھے روز اُس کا بخار اُترا تو اماں نے بڑے پیار سے پوچھا: "چھٹی کے دنوں کی تنخواہ تو ملتی ہے ناں بیٹا۔"(۲۸)

کلثوم بتاتی ہے کہ کچی نوکری ہے۔ کٹ جاتی ہے، توماں " میری مرد بیٹی " کہہ کر اُسے سکول بھیجنے پر راضی کرتی ہے۔ کلثوم اکثر چٹنی چڑھا کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر روتی ہے توماں کہتی ہے کہ اُسے رونے دو۔ مجھے کبھی یوں چھاجوں روتے دیکھا ہے تم لوگوں نے؟ کلیجہ جل جائے تو آنسو پک جاتے ہیں۔ رونے دو اُسے۔ لمحہ لمحہ کلثوم کی جاسوسی کی جاتی ہے۔ ایک بار جب وہ چھت سے نیچے آتی ہے تو بہن کے استفسار پر یوں بھڑک اُٹھتی ہے:

> "اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہو رہا ہے؟ اور کلثوم بھڑک اُٹھی۔ اُس کے تیور بدل گئے، رنگ زرد ہو گیا اور پھر زردی میں نیلاہٹ بھر گئی۔ چلاّ کر بولی: "میرے چہرے پہ لعنتیں ہیں، میرے چہرے پر ٹیکے ہیں کلنک کے۔ سنا آپ نے، میرے چہرے پر ساری دنیا کی نجاست پُتی ہوئی ہے۔ اب خوشی ہوئی آپ سب کو۔ کہیے تو دکھ اور بھی بتا دوں۔ میرے چہرے پر مردوں کے بوسے تھپے ہوئے ہیں اور میری آنکھوں میں بے حیائی ہے اور میری۔۔۔" (۲۹)

ماں کلثوم کو تھپڑ مارنے لگتی ہے لیکن سامنے بہنیں آ جاتی ہیں توماں کہتی ہے کہ یہ لومڑی کی صورت والی استانی کیا نبی معلوم ہوتا ہے۔ سکول نہیں جاتی، چکلے جاتی ہے۔ مردوں کے بوسوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اپنی کنواری اور بیوہ بہنوں کے سامنے آنکھوں کا پانی مر گیا۔

افسانے میں جابجا ایک نوجوان لڑکی کو زبردستی کولھو کا بیل بنانے کا عنصر موجود ہے۔ اس سے وہ کام لیا جا رہا ہے جو دراصل اُس کا ہے ہی نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس کے خواب دیکھنے پر بھی پابندی ہے۔ اُس کی ماں جان بوجھ کر کلثوم کے لیے گھر داماد کی شرط رکھ دیتی ہے جو کہ بلآخر جال پوری تیار کرنے کے لیے تیار بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن حالات کی ستائی کلثوم خود انکار کر دیتی ہے کیونکہ گھر داماد کی صورت میں بھی اُس کی زندگی میں کوئی بہتری کی امید نہیں، سوائے اس کے کہ ایک کھانے والے فرد کا اضافہ ہو جائے گا۔ احمد ندیم قاسمی کی طبقاتی فکر اور استحصالی طبقے کا درد محسوس کرنے کا انداز باقیوں سے بہت مختلف ہے۔ ندیم حقیقت نگاری کی اس اعلیٰ روایت کا محافظ اور معمار ہے جس کی تشکیل اور آب یاری پریم چند نے کی تھی۔ تانیثیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو احمد ندیم قاسمی کے کئی نسوانی کردار ہوس کاری کا شکار ہو کر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدنام کی "نوراں"، نرم دل کی "ناجو"، نومرد کی " لاڈلی"، رئیس خانہ کی "مریاں" اور سفید گھوڑا کی "بلقیس"، کا حالات کے جبر سے عصمت و آبرا کا سودا

کرنے پر نیم رضامند ہوتی ہیں۔اُن کے لیے کوئی غیرت مند سر نہیں کٹتا۔احمد ندیم قاسمی خود ایک مرد ہیں۔اُن کے ہاں اُن کے مرد کرداروں کے لیے نفرت یا حقارت نہیں بلکہ ہمدردی اور محبت کے جذبات ہی امڈتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ اُنھیں سنگ باری کا نہیں بلکہ محبت کا سزاوار سمجھتے ہیں۔اس عمل سے اُن کی معصومیت اور شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا۔اس لیے کہ یہ کردار اپنی اُس آسودگی اور تعفّن خیز تاریکی کے خلاف امکانی جدوجہد سے گریز نہیں کرتے، جس میں وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ندیم زندگی کے کرہیہ اور تاریک پہلوؤں کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔معاشرے میں ہر طرف تاریکی اور مجرمانہ سرگرمیوں کے علاوہ ہے ہی کیا؟دولت کی غلط تقسیم اور اُس سے پیدا ہونے والے حالات اور رشتے ہر قدم پر انسانی روح اور ضمیر کی گراں بازی اور پامالی کا منظر پیش کرتے ہیں۔احمد ندیم قاسمی کی عظمت یہی ہے کہ وہ اِس پُر آشاب زندگی، جس میں ہر لمحہ خواتین سمیت استحصال ہوتا ہے کہ تضادات کی مصوری کرتے ہوئے اُس بلند تر زندگی اور اس معلوم انسانیت کا ایک تصور بھی دیتا ہے جو انصاف، احساس، آزادی اور روحانی پاکیزگی کا مظہر ہیں۔اعلیٰ یا برگزیدہ انسانی زندگی کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا نقطۂ نگاہ فنی اعتبار سے افسانوں کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بازارِ حیات:

یہ افسانوی مجموعہ ادارۂ فروغِ اُردو لاہور نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔بازارِ حیات میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں پرمیشر سنگھ، گُل رخے، خونِ جگر، زلیخا بدنام، ست بھرائی، موچی، کفن دفن، بابانورا، ہیرا، مخبر، آسیہ اور دارو امن شامل ہیں۔افسانہ پرمیشر سنگھ فن کی معراج ہے لیکن تانیثیت کے زمرے میں نہیں بلکہ فسادات کے ذیل میں لکھی گئی کہانیوں کی فہرست میں آتا ہے۔افسانہ بدنام کا مرکزی کردار نوراں عصمت فروشی اس لیے کرتی ہے کہ اُس کا شوہر بے روزگار ہے۔پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے اور کوئی متبادل نہیں۔نوراں کا ہمسایہ ایک رات نوراں کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔تبھی اُس کی ماں سے ٹکرا جاتا ہے:

> ’’بے شرمی کی بات ہے لیکن نوراں رات میں کتنا کما لیتی ہے؟اندھیرے میں مجھے بُڑھیا کے آنسو نظر نہ آئے مگر اس کی آواز میں سیلن تھی۔ہم کنجر تو نہیں بیٹا۔میں نے کہا اس لیے میں کہتا ہوں کمبختو!کہ خدا

کے غضب سے ڈرو۔ بھرے گاؤں میں ایسی قہر توڑتی نہ پھرو۔ تم ہمارے پڑوسی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے یہ کہے کہ تمہارے پڑوس میں چکلا ہے۔"(۳۰)

ہمسایہ نوراں کو ہر روز ایک روپیہ دینا شروع کر دیتا ہے اور وہ یہ پیشہ ترک کر دیتی ہے۔لوگ باتیں بناتے اور مضحکہ اڑاتے ہیں اور بلآخر اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ نوراں نے بد معاشی ترک کر دی ہے اور افسانے کے آخر میں اس کا دس روپے کا نوٹ یہ کہہ کر واپس کر دیتی ہے کہ میرا گھر والا نوکر ہو گیا ہے اور مجھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔

بازارِ حیات میں ایک افسانہ " گُل رُخ " ہے جو ایک پٹھان کی بیٹی ہے اور بیمار ہے۔اُس کا باپ ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو درد بھرے لہجے میں کہتا ہے کہ میری بیٹی بیمار ہے اُس کا گھر آ کر علاج کریں اور بار بار کہتا ہے کہ "ہمارا بیٹی جوان ہے "ڈاکٹر اُس حسین لڑکی کا علاج کرتا ہے اور بالآخر وہ لڑکی صحت یاب ہو جاتی ہے۔تو ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنے کے لیے خان آتا ہے:

"دو روز کے بعد شام کو جب میں مطب کو بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو خان اندر آیا اور بڑے تپاک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتا ہوا بولا "کانسی بھی چلا گیا ڈاگدار صاحب، گُل رخ چلتا پھِرتا ہے، اچّا سوتا ہے" بڑا خوش ہے۔میں نے کہا خدا کا شکر ہے۔"(۳۱)

خان کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔مجھے خرید لیا ہے۔میری بیٹی کو اچھا کر دیا ہے۔میری بیٹی مرتی تو میں بھی مر جاتا، میری بیٹی جوان ہے۔اس پر ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ خان تم بار بار مجھے یہ کیوں بتاتے ہو کہ میری بیٹی جوان ہے؟ جس پر پٹھان ڈاکٹر کی سادگی پر ہنستا ہے اور بتاتا ہے کہ تم نے میرا ہزار روپیہ بچایا ہے۔ڈاکٹر کہتا ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آئی تو خان بتاتا ہے:

"دیکھو۔۔۔۔خان مسکرا کر بولا "ہمارا بیٹی بڑا اچا جوان ہے نا ہم کو گُل رُخ کی شادی کا پانچ تو ملتا ہے۔ہم ایک ہزار سے کم نہیں لے گا ۔تم نے ہمارا ایک ہزار بچایا ۔تم بڑا سچا مسلمان ہے، ڈاگدار صاحب!"(۳۲)

اس مرد معاشرے کی تشکیل اور عورت کے متعین کردار کی تعبیر و تشریح دنیا کا شاید سب سے اہم نہ سہی، تاہم اہم موضوع قرار بن گیا ہے۔ تبھی نسائی ادب کے تناظر میں تانثیت کی بنیاد پڑی۔یہ افسانہ بھی نسائی ادب کی ہی ایسی مثال ہے۔باپ اور بیٹی

کا رشتہ محبت اور احترام کا ہے لیکن خان اپنی بیٹی کے لیے اس لیے پریشان ہے کہ اگر یہ مر گئی تو وہ اس کو بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے محروم ہو جائے گا۔ یہ معاشرتی روّیے ہماری دنیا کے چہرے پہ بدنما داغ ہیں۔

اسی مجموعے میں ایک افسانہ "کفن دفن" ہے اس افسانے میں غفور اور کلی کے کرادار ہیں۔ غفور غریب آدمی ہے اور کلی وضع حمل کے دوران قریب المو ت ہے۔ ایک حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا عورت کے محسوسات دیکھیں :

"دیکھ غفورے میرا پیٹ کٹوادے میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں نے تو ابھی تم سے بہت تھوڑا سا پیار کیا ہے۔ ایسا کہا تھا اُس نے۔"(۳۳)

باوفا عورت مرتے وقت بھی اپنے پیار، اپنی محبت اپنے جیون ساتھی کے لیے ہر قسم کی تکلیف اُٹھانے کے لیے تیار ہے اور مرد۔۔۔غفور اپنی غربت کے سبب اپنی بیوی کلی کو اپنی کمائی سے کفن نہیں دے سکتا اور نہ باقی آخری رسومات ادا کر سکتا ہے۔ ایک درکردہ بزرگ جن کا اپنا بیٹا سڑک کے کنارے مر جاتا ہے۔ وہ کلی کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے یہ کلی نہیں حامد لگ رہا ہے۔ غفورا یہاں سے غائب ہو جاتا ہے اور تقریباً ایک سال بعد آکر چند نوٹ میاں سیف الحق کو یہ کہ کر دیتا ہے کہ مجھے اس سال میں ایک دن بھی چین نہیں آیا کہ میں کلی کو دفنانے کا انتظام اپنی کمائی سے نہیں کر سکا۔

"میاں جی! دیکھیے خفا نہ ہوئیے، آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میں ایسا کمینہ نہیں ہوں کہ اس احسان کو بھول جاؤں، پر بات یہ ہے میاں جی! کہ آپ نے کلی کی جگہ حامد میاں کو دفن کیا تھا اور مری کلی تو وہیں سڑک کنارے بے کفن پڑی رہ گئی۔ ان روپوں کو چاہے آپ نالی میں پھینک دیجیے، پر میں نے تو آج ہی اپنی کلی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا ہے میاں جی۔"(۳۴)

بازارِ حیات کا ایک افسانہ برکت اور زلیخا کی کہانی ہے۔ زلیخا دردِ زہ میں مبتلا ہے برکت پریشان ہے جبکہ گھر کا مالک انور اپنے دوستوں کے ساتھ محفل جمائے بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ میرا ناچنے کو جی چاہ رہا ہے۔ پہلی اولاد کا نشہ ہی اور ہوتا ہے۔ جس پر اُس کے دوست یاد دلاتے ہیں کہ بچہ برکت کا ہے، تمھارا نہیں۔ بِلی کو بے چینی، اضطراب، ڈر اور خوف کی علامت کے طور پر افسانے میں شامل کیا گیا ہے۔

"نوکروں کے کواٹروں کی طرف سے خوف اور دُکھ سے بھری ہوئی ایک چیخ بلند ہوتی ہے،" یہ زلیخا کی چیخ ہے"۔ڈرائینگ روم میں انور صوفے پر سے اُٹھ کر کہتا ہے،"زلیخا ہماری نوکرانی ہے" مگر زلیخا کیوں چیخ رہی ہے ؟" سجاد پائپ کو دانتوں میں دبا کر پوچھتا ہے "جِن آئے ہوں گے "فدا سگار کو ایش ٹرے میں سے اُٹھا کر کہتا ہے "جاہل عورتوں کے تو دو ہی کام ہیں یا تو اُن پر جِن آتے رہتے ہیں یا وہ بچے پیدا کرتی رہتی ہیں،بچہ ہی پیدا ہو رہا ہے "انور مُسکرا کر کہتا ہے۔"(۳۵)

انور دوستوں کو برکت کے بارے میں بتاتا ہے کہ یہ برکت ہے۔اس کی شادی کو چار سال ہوئے ہیں اور چار سال میں یہ چار سیر فولاد،کُشتہ فولاد کی صورت رکھا گیا ہے۔ قاری اس نوکھے تعارف سے گہری سوچ میں چلا جاتا ہے۔زلیخا انتہائی تکلیف میں ہے اور مسلسل شدت سے چیخ رہی ہے۔ حتیٰ کہ برکت آکر بتاتا ہے کہ زلیخا مشکل سے بچے گی، پر بچہ بچ جائے گا۔ یہاں انور حد درجے پریشان ہو جاتا ہے۔ دفعتاًزلیخا کے وحشت زدہ انداز میں چیخنے کی آواز آتی ہے۔انور گھبرا کر کواٹروں کی طرف چلا جاتا ہے۔اس کے دوست اُس کے پیچھے جاتے ہیں تو وہ رو رہا ہوتا ہے۔دوست کے پوچھنے پر وہ کہتا ہے کہ زلیخا نہیں مری بلکہ بچہ مرا ہے ۔دوست کہتا ہے پھر تم کیوں رو رہے ہو ؟انور کہتا ہے:

"یہ بچہ جو مر گیا ہے نا یہ برکت کا نہیں تھا"۔۔۔"تو پھر کس کا تھا؟"سجاد پوچھتا ہے،انور اپنا سر سجاد کے کندھے پر رکھ کر کہتا ہے "یہ صرف زلیخا جانتی ہے۔"(۳٦)

شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر میں بھی عورت کا وجود منفرد اور اچھوتے انداز میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔اب تنقید نگاروں کے ہاں نسائی اور تانیثی شعور کا خاص رنگ ان پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے جِس پر ادیبوں نے قلم فرسائی کی۔ نتیجتاً تنقیدی بصیرت کے حامل ادباءنے معاشرے میں موجود جبر واستبداد،استحصالی روش،سماجی ناانصافی،عدم مساوات کو اپنی تخلیق کا محور بنایا عورت کو ایک شناخت اور حقوق کی دستیابی کی۔اس جنگ میں احمد ندیم قاسمی نے اپنا حصہ ڈالا۔اب اردو ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جہاں تحریکِ حقوقِ نسواں، آزادی نسواں اور عورت کی الگ شناخت کی بازگشت سنائی نہ دیتی ہو۔

برگِ حنا:

۱۹۵۹ء میں ناشرین لاہور نے برگِ حنا شائع کیا۔ اس میں دس افسانے شامل ہیں ۔ان افسانوں میں ”بیٹے بیٹیاں ،ماتم ،دور بین، کھمبا،نصیب، وحشی، جن وِانس اور امانت“ وغیرہ شامل ہیں۔

افسانہ ”بیٹے بیٹیاں“ میں ازدواجی زندگی کی وہ ناہمواریاں جو عُمر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتی ہیں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں جذبات کا مدّ و جزر خارجی حالات کے پیچ و خم سے منسلک ہے اور جوانی کے فطری احساسات، کمزور پیش بندیوں کو توڑ کر جس طرح امڈ پڑتے ہیں۔ اُنھیں بہت ضبط اور سلیقے کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ ”بیٹے بیٹیاں“ میں ہادی کُمھار اپنی بیٹی کی اُٹھان سے پریشان ہے:

> ”صبح اُٹھتے ہی جب ہادی کی نظر نازو پر پڑی تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ بدلی ہوئی ہے اور اس کے گالوں میں کچھ ایسی چمک سی ہے کہ اتنی چمک چولھے میں ہو تو ہنڈیا میں پانی اُبلنے لگے۔“(۳۷)

اُسے دادا یاد آجاتا ہے جو کہتا تھا:

> ”لوگو! بیٹیوں کی آنکھوں میں چور بتیاں جلتی دیکھو، تو اُنھیں فوراً کہیں چلتا کر دو، چاہے اُنھیں گٹھڑی میں باندھ کر کسی کے دروازے پر ڈال آؤ۔ چور بتی جلتی رہے تو مسالہ ختم ہو جاتا ہے اور دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ماں باپ کے لیے ہر بیٹی کی عمر چودہ نہیں تو پندرہ سال ہونی چاہیے۔ اس کے بعد بیٹی مر جاتی ہے اور عورت پیدا ہو جاتی ہے۔“(۳۸)

ہادی کمھار کے ذہن پر بیٹی جوان ہونے کا اس قدر اثر ہے کہ وہ گھبرا کر بار بار نازو کی طرف دیکھتا ہے۔ اُسے کہتا ہے کہ تم کب جاگی ہو؟ اس نے کہا، اذان سے کہتا ہے کہ نماز پڑھی؟ اس کے نفی میں جواب پر ڈانٹ کر کہتا ہے کہ تمھیں لسی لانا یاد رہا اور نماز پڑھنا نہیں؟ تمھیں چاہیے تھا کہ مجھے بھی جگا دیتیں۔ وہ ہر وقت اس پر کڑی نظر رکھتا ہے اور بار بار اسے محسوس ہوتا ہے کہ نازو اپنی شکل تبدیل کر رہی ہے۔ وہ نازو نہیں کوئی بلکہ عورت ہے۔ وہ اس کے لیے رِشتہ تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ دوسرے گاؤں بیگو اس کا دور کا رشتے دار ہے، جس کی بیٹی شرفی اور بیٹا دینو ہے۔ دونوں آپس میں بات کرتے کرتے اس نہج پر پہنچتے ہیں کہ:

> ”سنو! یوں کیوں نہ کرلیں ہادی نے پوچھا ”کیا؟“ بیگو بولا ”دینو تمھارا داماد بن جائے اور تم میرے۔“(۳۹)

بالآخر وٹہ سٹہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ بے جوڑ شادی ہادی کمھار اور شرفی دونوں کے درمیان جھجک پیدا کر دیتی ہے لیکن وقت کے ساتھ دونوں ہنسنے بولنے لگتے ہیں۔ وقت کچھ اور آگے بڑھتا ہے۔ دینو اور نازو لائل پور چلے جاتے ہیں۔ بیگو فوت ہو جاتا ہے۔ شرفو اور ہادی خوش زندگی گزار رہے ہیں کہ پُر سکون جھیل میں قرار بن کر گرتا ہے۔ شرفی ہادی کو مشورہ دیتی ہے کہ مراد کی شادی کر دو۔ جب یہ میاں بیوی مراد کے لیے نادر کے گھر اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جاتے ہیں تو وہ بھی یہ شرط رکھتا ہے کہ میرے ساتھ کسی کی شادی کرا دو اور میری بیٹی لے جاؤ۔ ہادی کمھار بدنامی سے پریشان ہے۔ وہ گھر آکر شرفی کو طلاق دیتا ہے اور جا کر نادر کمھار سے کہتا ہے کہ تم نے پیر دستگیر کی قسم کھائی تھی "ہاں کھائی تھی" نادر حیران ہو کر بولا "تو لڑکی کو میرے گھر چھوڑ آؤ"، ہادی بولا۔ قریب کی چارپائی پر لیٹی لڑکی ایک دم سے اندر بھاگ گئی:

> کیوں ؟ نادر نے پوچھا" کام ہو گیا کیا ؟"، "ہاں ہو گیا" ہادی بولا، "کہاں" اس نے پوچھا، اور ہادی ٹوٹے ہوئے برتن کی سی آواز میں بولا، "میں بیوی کو طلاق دے آیا ہوں۔"(۴۰)

برگِ حنا میں ہی ایک کہانی "ماتم" ہے۔ اس میں میاں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے۔ وہ پُوتا سے ایک چینی کی پلیٹ لا کر تحفتاً اپنی بیوی کو دیتا ہے اس پلیٹ میں ایک نو پر ولڑکی کی تصویر کندہ ہے۔ وہ بیوی کو پلیٹ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح کہانیوں کے جِنوں بھوتوں کی جان طوطی میں ہوتی ہے، اسی طرح اس جن کی جان اس پلیٹ میں ہے کہ اس میں تم ہو شوہر کی وفات کے بعد بھی بیوی اس پلیٹ کو کلیجے سے لگا کر رکھتی ہے۔ شوہر کی وفات کے باوجود کوشش کے بیوی کو رونا نہیں آتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں رونا گویا محبت کا اظہار ٹھہرا۔

> "اور پھر بھاگاں نے جسے ایک مژدہ سناتے ہوئے کہا:
>
> "بی بی رو رہی ہے ؟ "
>
> چند عورتوں نے بکتی اور سسکتی ہوئی بی بی کا پھیگا ہوا خیرا اُٹھا کر دوسری عورتوں کو دکھایا ور سب جیسے حیران ہو کر بولیں، "یہ تو زار زار رو رہی ہے" پھر اندر کوٹھے میں کسی عورت نے ایک بچے کو زور کا چانٹا مارا اور اسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی دہلیز پر آ کر پکاری" نامراد نے بی بی کی پلیٹ کے ٹکڑے کر دیے۔"(۴۱)

اجمال اس کا یہ ہے کہ دنیا کی نظر میں خوشحال اور محبت سے بھرپور زندگی گزارنے والے دو میاں بیوی ہیں۔ شوہر مردانگی سے محروم ہے اور بیوی جسمانی ناآسودگی کا شکار ہے۔ یوں شوہر کے مرنے پر بھی اُسے چاہ کر بھی رونا نہیں آتا لیکن دنیاداری کا تقاضا ہے کہ عورت واویلا کرے اور دنیا کو دکھائے کہ اُسے بہت افسوس ہے۔ عورت کا اس پدری معاشرے میں نظریاتی سطح پر محنت ،حیثیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا خاندان میں اور کام کرنے والی جگہ پر غرض ہے۔ پورے عالم میں استحصال کیا جاتا ہے ۔اُسے کُچلا جاتا ہے۔ یہی اس افسانے میں دیکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ ”نصیب“ میں بیٹی کی جوانی اور اُس سے جُڑے تحفظات ہیں۔ماں بیٹی کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہے۔

> ”بیٹی !اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر کہنے دو مہینے کے اندر تمھارے ہاتھ پیلے نہ ہوئے تو اتنی ہی آگ میں جھلیں جائیں گے ۔۔ یہ دیکھا دیکھی تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ رضیہ بیٹی لیکن جب باپ کی موت بیٹی کی جوانی کا انتظار نہیں کرتی تو بیٹی کی جوانی کو باپ کی موت کیوں روکے اور پھر جوانی اپنی مرضی کی چیز تو نہیں ہے ،جوانی تو آجاتی ہے یہ تو ٹوٹ پڑتی ہے ،جوانی کو بہر حال آنا ہے جیسے گندم کی بالی کو پک کر آخر کار ،بہر حال سنہری ہونا ہوتا ہے۔شوہر کی موت کی طرح بیٹی کی جوانی بھی بیوہ کا نصیب ہے۔“(۴۲)

افسانے میں ایسے بیوہ ،ماں اور لاچار بیٹیوں کا ذکر ہے جِن کے سر پر کوئی نہیں۔ جب سر پر کوئی نہ ہو تو قریبی عزیز بھی نہیں پوچھتے اور مائیں مارے شرم کے ہلکان ہوئی جاتی ہیں کہ اپنے منھ سے کس کے سامنے جوان بیٹی کے لیے رشتے کا تذکرہ چھیڑیں ۔ ہماری معاشرت ہی اس قسم کی ہے۔ یتیم لڑکیوں کے بارے میں بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ جہیز کم لائیں گی۔ رئیسہ بیگم اپنے بھائی کو بُلا کر اپنی سہیلی زلیخا کے گھر بھیجتی ہے کہ وہاں اپنی بھانجی رضیہ کے رشتے کی بات کریں لیکن پتہ نہ چلے کہ میں نے بھیجا ہے ادھر یہ ماں بیٹی اکبر کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں کہ اُدھر سے ماموں اکبر کا خط آجاتا ہے کہ انھوں نے زلیخا کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی رخسانہ کی بات پکی کر دی ہے۔ ۱۵ رجب کو نکاح ہے۔ اللہ رضیہ کے نصیب بھی کھولے گا۔ برگ حنا میں ہی ایک افسانہ ”وحشی“ ہے جس میں ایک عمر رسیدہ عورت بس میں سوار ہوتی ہے وہ ہر کسی سے لڑتی جھگڑتی اور خواہ مخواہ کشیدگی پیدا کرتی ہے:

> ”کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور کہا ”ساڑھے پانچ آنے دے دو“۔ ”ساڑھے پانچ آنے؟“ بڑھیا نے چادر کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا، ”ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ غوثا کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں ۔اُس نے تو مجھے یہ گول مول چونی دی ہے“۔ اس نے چونی دو انگلیوں کی پوری میں ڈال کر کنڈکٹر کی

طرف بڑھا دی کنڈ کٹر بولا "نہیں مائی چار آنے نہیں، ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں"۔ بُڑھیا کی آواز تیز ہو گئی، "ساری دنیا کے چار لگتے ہیں، میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے؟ کیوں؟ ہڈھیوں کا تو ڈھیر ہوں ،میرا بوجھ ہی کیا ہے، لے چار آنے۔ "(۴۳)

کنڈ کٹر کے ساتھ بڑھیا ایک ہنگامہ کھڑا کر لیتی ہے۔ ساری بس اس ڈرامے میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہاں اصل مسئلہ غربت ہے، مفلسی ہے، بے روز گاری ہے، مہنگائی ہے، عسرت ہے۔ جہاں یہ چیزیں ہوں، وہاں جھگڑا، فساد اور باہم آداب کی کمی ہی ہوتی ہیں۔ یہ ایک آفاقی اصول ہے۔ بڑھیا بضد ہے کہ اُسے چار آنے ملے ہیں اس لیے وہ چار آنے ہی کرایہ دے گی جبکہ کنڈ کٹر بھی ضد پر اڑا ہوا ہے کہ کرایہ کم ہے۔ وہ ساڑھے پانچ آنے پورے لے گا۔ بس میں سوار ایک فقیر آدمی مائی کا کرایہ دے دیتا ہے اور مائی کے استفسار پر اُسے بتاتا ہے کہ پیچھے بیٹھے ایک چودھری نے آپ پر ترس کھا کر کرایہ دے دیا ہے۔

"بڑھیا اُٹھنے کی صورت میں سیٹ پر گر پڑی "کس پر ترس کھایا ہے؟"کنڈ کٹر بولا بڑھیا بھڑک کر اُٹھی اور چیخ کر بولی "ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو۔۔۔؟ یہ چھے پیسے تیری جیب میں بہت کود رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیے جیسے کُتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے؟ لیجیے یہ ہے بھلائی کا زمانہ "(۴۴)

کرایہ دینے والا شرمندہ ہو جاتا ہے اور بڑھیا ڈھیرے بکنے کے بعد جھکنے کے بعد پہلا سٹینڈ آنے پر اُتر گئی کہ:

"اے سخی داتا! تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے کھلنے کے انتظار میں کاٹ دیے ہیں تو ان ہاتھوں پر چھے پیسے رکھ رہا ہے۔ جنھوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی کریں تو پہاڑ بن جائے "تو مجھ پر ترس کھاتا ہے کیا تیری کوئی ماں بہن نہیں ہے۔ ترس کھانے کے لیے کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں۔ شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے؟"(۴۵)

مارکسزم کے تناظر میں لکھا گیا یہ افسانہ حقیقت نگاری کی عمدہ تصویر ہے جہاں غربت کا غویت انسان کے نگلنے کو تیار کھڑا ہے۔ غربت اپنی جگہ پر تلخ حقیقت سہی، لیکن محنت کر کے کھانے والے بے غیرت نہیں ہوتے۔ وہ تھوڑی کھا لیتے ہیں، لیکن غربت کے کھاتے میں اس میں تحصیص بھی نہیں۔ چاہے مرد ہو یا عورت، عقیدت و محبت تو سب میں ہی ہوتی ہے چاہے وہ ایک عمر رسیدہ وحشی عورت ہی کیوں نہ ہو۔ جہالت اور ناخواندگی کا پھیلاؤ، مایوسی اور غیر ذمہ داری، سپہ دار کے ذرائع میں اضافے کے بغیر آبادی میں مسلسل اور بے لگام اضافہ کرنا، سیاسی بحران، سماجی اور اقتصادی ترقی کی عدم موجودگی اور کمزوری، خانہ جنگیں، نو آبادیاتی مسائل، ریاست کو غیر مستحکم کرنے والے تنازعہ کا پھیلاؤ، دہشت گردی، تخریب کاری، مطلق الصنائی، نگران اداروں کی عدم موجودگی، حکمرانوں کی عیاشیاں اور قومی صلاحیتوں کا ضیاع، وہ عوامل ہیں جو غربت پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس غربت سے بہت سے معاشی اور معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ جن کی ذیل میں ایک جرم سنائی تصور کی کمی بھی ہے۔ احمد ندیم قاسمی تانیثی شعور کے شارح ہیں۔ وہ اپنے قلم کے ذریعے تانیثی شعور پیدا کرنے اور نسانی مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی قاری کی ان حقیقتوں تک رسائی کرتے ہیں جہاں دوسرے لکھنے والے نہیں پہنچ پاتے۔ اُن کی تحریر وسعتِ مشاہدہ اور عملی تجربات کی ترجمان ہے۔ تعلیمِ نسواں اور تربیتِ نسواں کو ۱۸۵۷ء کے بعد ہر ذمہ دار ادیب نے محسوس کرتے ہوئے اس موضوع کو اپنی تخلیقات میں برتا ہے اور عورت کے تجربات اور معاملاتِ زندگی کا ذکر اپنی تحریروں میں جراحت سے کیا ہے۔

گھر سے گھر تک:

"گھر سے گھر تک" افسانوی مجموعے میں کُل ۹ افسانے شامل ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں راول کتاب گھر راولپنڈی نے اس مجموعے کو کتابی شکل میں طبع کیا۔ اس مجموعے میں "گھر سے گھر تک"، "ثواب"، "اصول کی بات"، "موج خون"، "فالتو"، "شیش محل"، "سلطان"، "بھاڑ" اور "بندگی، بے چارگی افسانے" شامل ہیں۔

سب سے پہلا افسانہ "گھر سے گھر تک" ہمارے معاشرتی روّیوں کی بھیانک تصویر ہے۔ دکھاوا دراصل اپنی حالت کو چھپانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں بہت سی اخلاقی بُرائیاں اسی وجہ سے پنپ رہی ہیں کہ ہم حقیقت کا کھُلے دل سے سامنا نہیں کر سکتے۔ یعنی بیٹی بیاہنا جوئے شیر لانے کے مانند ہے۔ اوّل تو رشتہ تلاش کرنا ہی ایک مسئلہ اور اگر یہ مرحلہ طے ہو جائے تو جہیز جیسی رسم شریف، سفید پوش اور متوسط طبقے کے والدین کے لیے آزمائش سے کم نہیں۔ عشرت خانم اپنے بیٹے وقار اور بیٹی ہما کے

ساتھ رشتہ دیکھنے جاتی ہے۔لڑکی والوں کی سج دھج دیکھ کر یہ لوگ خواب بُن لیتے ہیں کیونکہ وہ حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔لڑکی والوں کے ہاں گفتگو کا انداز دیکھیے:

"صوفہ دیکھیے!بالکل نئے فیشن کا ہے"،ہُما نے تبصرہ جاری رکھا۔"تپائیوں پر رکھے عجائبات دیکھیے۔وقار!مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے،وہ مٹی کا ہے یا لکڑی کا؟"

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا،

"نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا،مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے،شاید عقیق کا ہے۔"

"عقیق کا؟"عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لیے آدھی اُٹھ گئیں۔"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں؟"ہُمانے جھوم کر کہا،"ایسے ٹھاٹ کہیں نظر نہیں آئے۔"

عشرت خانم ہاتھ مَل کر بولیں،

"اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی؟"

"تو کیا ہے اماں؟"ہُما بولی،"اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"(۴۶)

حرِص و ہوس نے ہماری اخلاقی اقدار کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔افسانے میں بھی تصنع اور مصنوعی آداب سے بھرپور گفتگو کے بعد رشتہ تقریباً طے ہے۔دونوں طرح کے فریقین ایک دوسرے سے بُری طرح متاثر ہیں۔نور النساء اور جمیلہ اوپر جاتے ہیں کہ اسی اثنا میں باوردی ڈرائیور اندر آکر عشرت خانم سے کہتا ہے کہ جلدی چلیں۔عشر خانم الوداعی غرض سے اوپر جاتی ہیں تو منظر دیکھ کر دھنگ رہ جاتی ہیں:

"اے کلثوم!اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لیے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔میں تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اِسے مدھولنے چلا ہے۔سلیمہ کیا کہے گی کہ۔۔۔۔(۴۷)

عشرت خانم کو اوپر آتے دیکھ کر یکایک نور النساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ عشرت خانم نور النساء کو ایک طرف کر کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ سامنے کا منظر ملاحظہ کیجیے:

"یکایک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔

میلی داغوں دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سِرا اُٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادراتن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصوم کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائنتی کے پاس چھے برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی اُنگلیاں چوس رہا تھا۔ اُکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش، پر ایک جیسی عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے ،چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی۔"(۴۸)

انسانی تاریخ سے اگر مذہب کو الگ کر دیا جائے، تو انسانی زندگی حیوانوں سے بھی بد تر نظر آنے لگتی ہے۔ عورت کی معیشت، اُس کے کردار، اُس کے سلیقے اور اُس کی حیا سے ہے لیکن فی زمانہ یہ چیزیں اور گھر گھر ہستی کے بجائے روپیہ، پیسہ، دولت اور گاڑیاں دیکھی جاتی ہیں۔ اس چکر میں لڑکے والے اپنی حیثیت تک بھول جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے:

"ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں، بھئی دیکھو! تم کار واپس لے جاؤ، ہم لوگ تانگے سے آجائیں گے۔ بیگم صاحبہ کو سینما دیکھنے جانا ہے تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیے کار مانگ کر لائے ہیں، وہ اِس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔۔۔۔ پھر وہ اس طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنساء سے لپٹ کر بولیں، "اے بہن نور النساء! خدا کے لیے، ہنسیے، کیا یہ ہنسی کی بات نہیں کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن! میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔"(۴۹)

اس مجموعے میں ایک افسانہ اصول کی بات ہے۔اصول کی بات زمیندار اور عبداللہ کی کہانی ہے جسے زمین دار تحقیر سے ''ڈلا'' کہتا ہے۔عبداللہ زمین دار سے کچھ زمین کاشت کرنے کے لیے مانگتا ہے جس پر زمین دار عجیب وغریب باتیں کرتا ہے:

''دیکھو بھئی ڈلے! میں زمینوں کو جتواتا نہیں ہوں۔میں تو انھیں کولھو میں پلواتا ہوں اور کولھو چلانے کے لیے مجھے بڑے بڑے مظبوط بیلو جیسے کسان چاہیے''،

لوگوں کی ہنسی نے زمیندار کی بات کاٹ دی اور وہ خود بھی ذرا سا مسکرایا۔پھر بولا،''اور تم بڈھے آدمی ہو، بال کھچڑی رہے ہیں، ہاتھ کانپ رہے ہیں۔تم کیا ہل چلاؤ گے ؟ اور پھر فرض کیا تم نے ہی ہل چلایا تو تم اکیلے آدمی ہو، بیمار پڑو گے تو کھیتوں کی رکھوالی کون کرے گا؟ بیٹی تو اپنے گھر چلی جائے گی، بیوی ہے ؟''

''جی ہے۔''

''چلو یہ تو اچھا ہے، بیوی تو ہے، بیوی ہونی چاہیے، ہل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے۔''(۵۰)

زمین دار عبداللہ کا مضحکہ اڑاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تمھیں پچھلی جگہ سے کیوں نکالا گیا تھا؟ جس پر عبداللہ بتاتا ہے کہ میں نے مہنگائی کا تذکرہ کیا تھا کہ ''چنا مہنگا جا رہا ہے''۔اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ماتحت یا غریب مضارع کی اپنی کوئی رائے نہیں۔عبداللہ کو یاد کرتا ہے کہ زمیندار سے بے دخل ہونے کے بعد وہ کئی دن سے بھٹک رہا ہے اور کل جب وہ مسجد کے سامنے بھیک مانگ کر روٹی لایا تھا تو بیوی نے کہا:

''کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنو بیچ کر روٹی لی ہے۔پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔مالکاں کے بابا/امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کو کوئی نئی مسجد ڈھونڈیں گے۔اللہ اللہ کرو۔وہ جب ترس کھائے گا تو بدلہ چکا دیں گے۔چار روٹیاں لائے ہو۔آٹھ اپنے ہاتھ سے پکا کر اور گھی لگا کر فقیروں کو نہ کھلاؤں تو ڈائن ہو کر مروں۔''(۵۱)

جب زمین دار کی چوپال میں محفل جمتی ہے تو زمین دار کی قدموں میں بچھائی گئی چادر پر کچھ نہ کچھ رقم میراثیوں کے لیے رکھتے ہیں۔عبداللہ بھی بھیک میں ملی واحد چونّی اس کپڑے پر رکھ دیتا ہے، جس پر زمین دار خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ '' نئے اور پرانے آدمی میں یہی وضع داری کا فرق ہے۔بے روز گار ہے، ابھی میرے مزارعوں میں بھی شامل نہیں لیکن اس نے واحد چونّی

میری تقلید میں دے دی۔ اصول اصول کی بات ہے نئے مزارعوں کو جوتی بھی سیدھی کرنا نہیں آتی۔"بعد میں سائیں عبد اللہ کو آکر بتاتا ہے کہ چاچا تمھارا کام مجھے بنتا نظر آرہا ہے۔ تمھیں زمیندار شکار گاہ والی زمین دینے کا سوچ رہا ہے لیکن ایک بات کی وجہ سے معاملہ بگڑ رہا ہے:

"سائیں آہستہ سے بولا،"تمھیں لے چلتا ہوں ڈیوڑھی میں۔ یوں کرو کہ تمہاری بیٹی ہے ناں مالکاں، اُس کو سمجھا دو۔"

"کیا سمجھا دوں؟۔۔۔وہ کیا کرے گی؟" عبد اللہ نے پوچھا۔

اور سائیں بولا،"ارے چاچا! اس کو سمجھا دوناں، اُس سے کہہ دوناں مان جائے۔ آدھی بات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی ہے، نہ وہ مانتی ہے نہ اُس کی ماں اُسے مناتی ہے۔ اب تم بھی نہ منا سکو تو سرکار کہتے ہیں۔ اپنی راہ لو، اصول کی بات ہے۔"(۵۲)

کپاس کا پھول:

یہ افسانوں مجموعہ مکتبۂ فنون لاہور نے ۱۹۷۳ء میں شائع کی۔ سترہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانوں پر مشتمل ہے۔ تبر، فیشن، سفارش، مائیں، پہاڑوں کی طرف، گڑیا، تھَل، پاگل، ماسی گل بانو، بے نام چہرے، کپاس کا پھول، سفید گھوڑا، سکوت وصدا، آسیب، لارنس آف تھیلیبیا، قرض اور مشورہ اس میں شامل ہیں۔ سفید گھوڑا احمد ندیم قاسمی کی فنی ہُنر مندی اور عمیق مشاہدے کا نادر مجموعہ ہے۔ عورت کی مجبوری اسے بار بار کہنے والی چیز بنا دیتی ہے۔ یہ دو دوستوں الیاس اور رؤف کی کہانی نہیں بلکہ اس معاشرے کی کہانی ہے جہاں دولت مند حسن وجوانی کے خریدار بنتے ہیں، تو اُنھیں شرب کی بوتل کی طرح نئی عورت کی حاجت ہوتی ہے۔ الیاس کے لیے سراج نے جس لڑکی کا سودا کیا تھا۔ اُس کا نام بلقیس تھا۔ لیکن رؤف کے لیے مشتاق نے جس لڑکی کا سوا کیا تھا وہ تھی تو بلقیس لیکن خریدار نئی بوتل کے ساتھ نئے چہروں کا بھی متلاشی ہے، اس لیے اس کی ضرورت مند اور مجبور ماں نے اُسے رضیہ کے روپ میں پیش کیا۔ رؤف نے بلقیس کو پہچان لیا تو عورت رؤف کے قدموں میں گر گئی اور فریاد کرنے لگی:

" میرا پردہ رکھ لیجیے صاحب!میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔میں کیا کروں صاحب میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔میں اپنی بیٹی کو کیسے بدلوں صاحب ؟اس لیے شہر بدل لیتی ہوں۔مجھ بھگوڑی کو کیا پتہ تھا کہ آپ لوگ بھی شہر بدل لیتے ہیں۔خدا کے لیے صاحب،خدا کے لیے میرا اور میری بیٹی کا پردہ رکھ لیجیے ورنہ کوئی ہمیں دو پیسے بھی نہیں پوچھے گا۔"(۵۳)

سفید گھوڑا دراصل شراب کا نام ہے اور شراب کے ساتھ شباب لازمی ہے۔افسانے میں جسم کی بنیادی ضرورت روٹی کے لیے جسم بیچنے کا ہی ذکر ملتا ہے اور جسم تو ہمیشہ عورت کا ہی بِکتا آیا ہے۔فَقر و فاقہ میں مبتلا ماؤں اور نادار و محرومی کے کچو کے سہتے ہوئے بچوں کے مصائب کو ندیم نے بڑی دردمندی کے ساتھ سمجھا اور انقلابی نظر کے ساتھ پیش کر دیا۔معاشی استبدال کی لپیٹ میں آئے ہوئے معاشرے میں بلقیس جیسی عورت پہلے سے بِکنے والی عورتیں روپ بدل بدل کر بِکنے پر مجبور ہیں۔ہمارے ہاں کے سرداری اور جاگیرداری نظام میں وڈیرے،زمیندار اور چودھری عنفوانِ شباب کے سادہ و معصوم نسوانی حسن کو تاراج کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔مضمون "اردو افسانہ نگاری میں ندیم کا مقام "میں پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں:

"گڑیا کی بانو اور مہراں۔۔۔۔ہو یا ماسی گل بانو اور تاجو مراثن ہو،یہ وہ کردار ہیں جو ایک انتہائی پسماندہ اور ضعیف الاعتقاد معاشرے کی رسمیات کے دباؤ میں آکر معمول کی انسانی زندگی سے کٹ جاتے ہیں۔قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے یہ بھٹکے راہی جن ہو جاتے ہیں اور پریاں قرار پاتے ہیں۔"(۵۴)

لارنس آف تھیلیبیا کپاس کے پھول مجموعے میں شامل افسانہ ہے۔تھل کے جاگیردار کے جوان بیٹے نے اپنے باز کا نام "لارنس آف تھیلیبیا" رکھ چھوڑا ہے۔خدا بخش نے اس باز کی دیکھ بھال کے لیے " بشکو"مقرر کر رکھا ہے۔خدا بخش،بشکو اور افسانے کا واحد متکلم پرندوں کے شکار پر نکلتے ہیں۔خدا بخش ایک درخت پر بیٹھی ہوئی لالی کو دیکھ کر اپنے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتر تا ہے اور پھر:

"ایک دم باز پر جیسے وحشت طاری ہو گئی۔موت کی تلوار ہوا کو کاٹتی چلی گئی اور لالی اُڑ گئی مگر باز نے آن کی آن میں اُسے جالیا۔لالی کی چیخ نے اُس ویرانے کو ذرا سا چونکایا اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے

واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا۔ تب اُس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اُس کی مُڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی۔"(۵۵)

راوی اس موقع پر خدا بخش کو کہتا ہے کہ تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔ واپسی پر خدا بخش کی بہن کی سہیلی رنگی سامنے آ گئی جو ایک غریب مزارع کی بیٹی ہے۔ خدا بخش رنگی کو فریب دیتا ہے کہ اُس کے والد نے اُسے پیغام بھیجا ہے کہ شام کے وقت واپس آنے کے بجائے رات کو خدا بخش کی بہن کے ساتھ ہی قیام کر لے۔ صبح بشکو نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں اطلاع دی کہ کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی۔ لارنس مرا پڑا ہوا ہے۔ خدا بخش سکتے کے عالم میں کہتا ہے کہ " رنگی کو یہاں لے آؤ"۔ بشکو بتاتا ہے کہ وہ تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی، جس پر خدا بخش کہتا ہے:

"خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا،

"دیکھا! میں نہ کہتا تھا؟ میرے باز کو اسی کمینی نے مارا ہے۔ رات کو بار بار کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کہا، "لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں، نادان"۔ اُسی نے مارا ہے میرے لارنس کو۔ میں جانتا ہوں یہ قتل اُس بد ذات، کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے۔ میں اُس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اُس کی۔۔۔۔"(۵٦)

اس اختتامی اقتباس میں " لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتی نادان" کا قصہ شکار کا جملہ شکار کے مناظر میں باز کے لالی پر جھپٹنے، لالی کی بوٹیاں نوچنے اور اس کی ہڈی پر سے کچا، تازہ اور وٹامن سے بھرپور گوشت اتارنے کی سی جزئیات کو نئی اور تلخ تر علامتیں معنویت سے لبریز کر دیتا ہے۔ پھر شکار کا جو منظر خدا بخش کے لیے لذت سے بھرپور تماشا ہے، وہی منظر راوی اور کراہت کا عمل پیدا کرتا ہے۔ "لعنت! تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے"، گویا یہ پورے جاگیر داری نظام کی درندگی پر ایک بلیغ تبصرہ ہے۔ اور رنگی کا لارنس کی گردن مروڑ کر پھیک دینا تانیثیّت کے تناظر میں اُٹھی گئی بغاوت ہے۔

ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار کا کہنا ہے کہ:

"جتنی کثیر الجہات افسانوی تصویریں احمد ندیم قاسمی کے ہاں نظر آتی ہیں، پورے اُردو ادب میں اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔"(۵۷)

افسانہ ماسی گُل بانو امنگوں اور آرزوؤں کے مر جانے اور ارمانوں کے مٹ جانے کا مظہر ہے۔ گُل بانو کی عین شادی کے دن بیگ کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔ گُل بانو غش کھا کر گرنے سے معذور ہو جاتی ہے اور لنگڑا ہو کر چلنے لگتی ہے۔ باپ بھی فوت ہو جاتا ہے۔ غربت اور مفلسی کے سبب کمزور ہو جاتی ہے۔ گُل بانو کی روزی روٹی کا بندوبست اللہ دیوں کرتا ہے کہ گاؤں میں کسی کے گھر سے آٹا مانگنے جاتی ہے۔ وہ ڈر جاتے ہیں اور پانچ روپے دے کر جانے کی استدعا کرتے ہیں۔ گھر جا کر ماسی قہقہے لگانے لگتی ہے جس سے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اِس کے پاس جِن ہیں یا ماسی گُل بانو پر آسیب ہیں۔ لوگ اس سے کچھ فرضی اور حقیقی باتیں منسوب کر دیتے ہیں۔ اُس کی برسوں سے ایک ہی روٹین ہے کہ وہ صبح مسجد کے محراب کو چومتی ہے۔ اس کے صحن میں جھاڑو لگاتی ہے۔ جہانے مراثی گھر سے آگ لیتی ہے اور شام کو مسجد میں چراغ روشن کرتی ہے۔ گاؤں کے لوگ عید کے عید سوٹ اور پانچ روپے ماسی گُل بانو کے گھر بھجوا دیتے ہیں۔ ماسی ہر عید کے بعد دو تین دن کے لیے غائب ہو جاتی ہے اور جہانے مراثی کی بیٹی کو بتاتی ہے کہ میں اپنا کفن لینے جاتی ہوں۔ تاجو کی خراب حالت دیکھ کر ماسی مشورہ دیتی ہے کہ کہ اس کی شادی کر دو یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ایک دن ماسی اپنے گھر سے نہیں نکلتی تو لوگ ہمّت کر کے اُس کے گھر جاتے ہیں جہاں ماسی دُلھن بنی ہوتی ہے اور سمجھتی ہے کہ برات آگئی ہے اور جب اُسے سمجھ آتی ہے تو وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ گھر میں جگہ جگہ جہیز کا سامان بکھرا ہوتا ہے:

> ”فطری زندگی کے نشاط والم سے محروم رہ جانے والے لوگ ہوں یا ندیم کے افسانوں کی دیوانی عورتیں یا چڑیلیں ہوں۔۔۔۔ یہ ندیم کی وہ مخلوق ہیں جن کی روح اتھاہ دُکھوں، محرومیوں اور جانکاہ صدموں سے نڈھال اور زخموں سے چُور ہے۔ جو گردوپیش پھیلی ہوئی شیطانیت، درندگی اور سفاکی کی تاب نہ لا کر اپنے ہوش وہواس کا حصہ گنوا بیٹھتی ہے لیکن اس کے باوصف اُن کی روح میں محبت، انسانیت، غیرت وحمیّت کی شمع ٹمٹما رہی ہے۔“(۵۸)

احمد ندیم قاسمی نے اُردو ادب کو زندگی سے بھرپور بہت سی اچھی اور یادگار تخلیقات کا سرمایہ دیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اُن ادباء میں شامل ہیں جنھوں نے ادب کو پروپیگنڈا بنانے کے بجائے فن رہنے دیا۔ غیرت مندی، خودداری اور عزتِ نفس ندیم کا خاص موضوع ہے۔ غربت اندھیرا بن کر چھا جانے پر کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کردار ستارہ بن کر جھلملانے لگتا ہے اور رنگی کی طرح مقدور بھر بغاوت ضرور کرتا ہے۔

نیلا پتھر:

مجموعہ نیلا پتھر میں نو افسانے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں احسان، عورت صاحبہ، جوتا، اندمال، عالاں، نیلا پتھر، ایک عورت تین کہانیاں، بارٹر اور ایک احمکانہ محبت کی کہانی شامل ہیں۔

پہلا ہی افسانہ "احسان" ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو مسائل کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ اُس کا والد بیمار ہے اور یہ پردہ کرتی ہے لیکن پڑوسی کو بُلانا مجبوری ہے۔ واحد متکلم کردار صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پردہ اُٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ دوا کے ساتھ ساتھ گھر کا سودا بھی لے آتا مگر بات چیت "تکلیف معاف اور آپ نے بڑا احسان کیا ہے" سے آگے نہ بڑھی:

> "رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تھا تو اُس کی ایک ایک حرکت کا بہت گہرا نفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ سودے کے لیے رقم دیتے ہوئے اُس کی پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھُو گئی تھیں۔ پرسوں شام کو وہ میرے سامنے دوپٹے کے بغیر یوں ہی تو نہیں آ گئی تھی۔ مجھے جو اُس نے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں رُل جاتی۔ تو اتنی بامعنی بات اُس نے یوں ہی تو نہیں کہہ ڈالی تھی، میں اُسے رُلنے نہیں دوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں رُلنے کے لائق نہیں ہوتیں۔"(۵۹)

واحد متکلم مردانہ کردار اویس اظہار کے مختلف طریقے سوچتا ہے کہ صبیحہ بتاتی ہے کہ:

> "اویس صاحب! وہ چارپائی کو گھسیٹ کر میرے اور قریب آ گئیں۔ دنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سہیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔"(۶۰)

صبیحہ بتاتی ہے کہ اُس کے دو سگے بھائی ہیں جو بیرونِ ملک رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اُدھر ہی شادیاں کر لی ہیں۔ میرے والد بیمار ہیں۔ اُن کا صحت یاب ہونا مشکل ہے۔ صبیحہ کہتی ہے:

> "اگر میں براہِ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے حیا سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ابھی محلے میں بات زیادہ نہیں پھیلی کہ کھوکھے میں منیاری کی دوکان کرنے والا قریشی مفلوج ہو چکا ہے۔ جس روز سارے محلے کو یہ بات معلوم ہو گئی میں ایک ایسی لڑکی بن جاؤں گی جو رات کے اندھیرے میں سڑک پر گزرتے ہوئے، غنڈوں کے نرغے میں آ جاتی ہے۔ میرے گھر میں پتھروں پر لپٹے ہوئے محبت نامے گرنے

لگیں گے۔ میرے گھر کے دروازے پر لوگ مجھ پر آوازیں کَسیں گے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص گھر میں زندہ موجود ہے مگر میں اِس گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں اور ہمارا معاشرہ جو اپنے آپ کو بڑا مقدس کہتا ہے، اکیلی اور بے آسرا لڑکی پر یوں جھپٹتا ہے، جیسے گدھ مُردار پر جھپٹتے ہیں۔ سو میں نے فیصلہ کیا ہے اویس صاحب! کہ مجھے فوراً شادی کرلینی چاہیے۔"(۶۱)

اویس دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے اور صبیحہ کو بتاتا ہے کہ ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔ میں شام کو بتاؤں گا، جس پر صبیحہ کہتی ہے کہ خیال رکھیے گا، میں اکیس سال کی ہوں۔ سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لیے زندگی کا تجربہ بہت ضروری ہے۔ کم عمر لڑکے ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔

احسان ہمارے تہذیب، ہمارے معاشرے کا وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی کریہہ صورت دیکھ سکتے ہیں۔ بیٹے ہیں، لیکن اپنی ذمہ داروں سے جان چھڑا کر بیرونِ مُلک سُکھ کی زندگی گزار رہے ہیں جبکہ جوان بہن عمر رسیدہ، بیمار باپ کی خدمت کر رہی ہے۔ عورت ہمیشہ قربانی دیتی آئی ہے حتیٰ کہ اپنے تحفظ کے لیے خود سے بڑے مرد کا انتخاب محض اس واسطے کرتی ہے کہ اُسے تحفظ حاصل ہو۔ کوئی اُس کے کردار پر انگشت نمائی نہ کرے جس کے نتیجے میں بدنامی اُس کا مقدر ہو۔ اس مجموعے میں ایک افسانہ عورت صاحبہ ہے۔ یہ ایک نشہ کرنے والے کی کہانی ہے جو سُرور میں آنے کے بعد عورت عورت پکارتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کلب یا ان محفل میں آنے والے لوگ اِس چیز کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایک دن اسی طرح امتیاز نشے میں عورت عورت پکار رہا تھا کہ ماجد صاحب پوچھتے ہیں کہ کونسی عورت؟ جس کے جواب میں امتیاز کہتا ہے کہ بس ایک عورت، ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ ماجد صاحب امتیاز کو اپنی بیوی سے دُور لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

"مسٹر امتیاز! اگر آپ کو عورت کی ایسی ہی طلب ہے تو آیئے میں آپ کو عورت نہیں بلکہ عورتوں کے پاس لے چلتا ہوں۔

"چلیے" امتیاز قدم اُٹھانے کی کوشش میں لڑکھڑایا۔

"مگر ایک شرط پر۔"

"کیا شرط؟" ماجد صاحب نے پوچھا،

> "شرط یہ ہے کہ جو بھی عورت ہو، ایسی ہی فرسٹ کلاس عورت ہو"، امتیاز نے ماجد صاحب کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور دیر تک اُٹھائے رکھی۔
>
> "اس سے بھی بڑھیا"، ماجد صاحب بولے، "آیئے۔"(۶۲)

امتیاز نشے کی حالت میں کہتا ہے کہ اس سے بہتر کیا ہو گی، نہیں ہو سکتی۔ ماجد صاحب کہتے ہیں کہ آپ چلیں تو سہی، اِس سے بھی اچھی ہو گی۔ ماجد صاحب اُسے کھینچے چلے جا رہے تھے۔ سارا مجمع حیران ہو رہا تھا۔ ماجد صاحب امتیاز کو گاڑی میں اُس کے گھر لے جاتے ہیں۔ وہاں جا کر امتیاز کے والد سیٹھ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور امتیاز سے کہتا ہے کہ تم تھوڑی دیر سو لو۔ سیٹھ صاحب سے مل کر ماجد صاحب امتیاز کی والدہ اور بہن کو بھی بُلانے کی استدعا کرتا ہے۔ سیٹھ صاحب معاملہ نہ سمجھتے ہوئے دونوں کو بُلا لیتے ہیں۔ جنھوں نے بڑی بڑی چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور اُن کے چہروں پر تشویش تھی۔ ماجد جا کر امتیاز کو ڈرائینگ روم میں لاتا ہے:

> "یہ لیجیے مسٹر امتیاز! میں نے اپنا وعدہ پُورا کر لیا۔ یہ ہیں آپ کی بہن اور یہ ہیں آپ کی ماں۔ یہ دونوں بھی عورتیں ہیں۔ ٹھیک ہے ناں؟
>
> امتیاز دیوانوں کہ طرح ماجد صاحب کو دیکھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرو چھُپا کر بچوں کی طرح بِلک بِلک کر روتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی ماں، بہن اور باپ اُس کی طرف بڑھے اور اور ماجد صاحب نے اپنا سینہ پھیلا کر اپنے پھیپھڑے یوں بھر لیے جیسے مدت سے ہوا کو ترس رہے ہوں۔"(۶۳)

افسانہ عالاں تانیثیت کی عمدہ مثال ہے۔ وہ موچی کی بیٹی ہے۔ کارزارِ حیات کو چلانے لے لیے وہ گاؤں والے چھوٹے موٹے کام کرتی ہے جیسے مرچیں پیسنا، چکی چلانا، رضائیوں میں ڈوریں ڈالنا وغیرہ۔ وہ ایک مضبوط کردار کی لڑکی ہے اور گاؤں کے نوجوانوں کو گھاس نہیں ڈالتی۔ عارف چوھدری کا بیٹا ہے۔ عالاں اُن کے گھر کام کرتی ہے اور عارف کو اندر ہی اندر پسند کرتی ہے جبکہ عارف ٹائم پاس کرنا چاہتا ہے لیکن ظاہری سٹیٹس کی وجہ سے جھجھکتا رہتا ہے۔ ایک دن عالاں کو دینے کے لیے چودھرانی عارف کو چاول دے کر بھجتی ہے۔ وہاں عالاں سے بات کرتے ہوئے عارف کہتا ہے کہ تم چکّی پیس لیتی ہو، چھتیں لیپ لیتی ہو، مرچیں کوٹ لیتی ہو، کنویں سے دو دو گھڑے پانی لے آتی ہے۔ پورے گھر کا کام بھی سنبھال لیتی ہو۔ تم کس مٹی کی بنی ہو عالاں؟

"وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر دو قدم اُٹھا کر میرے اتنے قریب آگئی کہ مجھے اپنی گردن پر اُس کی سانس محسوس ہونے لگی، "میں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں!"، اُس کی آواز میں جھنکار سی تھی، "آپ کو کیا معلوم میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں"، ذرا سے وقفے کے بعد بولی، "مجھ سے پوچھیے ناں، میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں"۔

پہلی جماعت کے بچے کی طرح میں نے اُس سے پوچھا، "اور کیا کچھ کر سکتی ہو؟"

"میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں!"، اُس نے جیسے کائنات کا راز فاش کر دیا۔"(٦٤)

احمد ندیم قاسمی نے عصری و ادبی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تہذیبی و لسانی تناظر میں وقت کا ساتھ دے کر صحت مند ادب تخلیق دینے کی ذمہ داری کو نبھایا ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کو شاندار افسانے دیے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں پندرہ مجموعے مرتب کیے گئے ہیں جن میں 169 افسانے ہیں۔ اِن افسانوں میں مختلف معاشرتی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے، جن میں زیادہ تر کرداروں کی غربت، دیہی زندگی، نچلے طبقے، معاشرے کے پِسے ہوئے طبقات بشمول عورت اور اُن کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ عورت، اُس کے مسائل، اُس کی محرومیوں، اُس کی جنسی ناآسودگی، اُس کی نفسیاتی گِروں اور دشواروں کو باریک بینی سے دیکھا اور قلم بند کیا۔ اُن کے دل میں اِس طبقے کے لیے ہمدردی کے جذبات موجود تھے جس کا اظہار اُن کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ ایسے کرداروں کی تخلیق وہی فنکار کر سکتا ہے جس کے دل میں انسانیت کے لیے خصوصی ہمدردی کا جذبہ موجود ہو۔ احمد ندیم قاسمی نے افسانے کے فنی لوازمات کا التزام رکھتے ہوئے سماج کے اُن کَرب ناک پہلوؤں کو تخلیق کا حصہ بنایا، جِن کو ہمارے معاشرے نے جائز سمجھ کر روا رکھا ہے اور یہ بھول گیا ہے کلہ اس نظام کے اصول و ضوابط میں کہیں نہ کہیں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ناانصافی کر کے انجانے میں یا شعوری طور پر اُس کے حقوق کو سلب کر رہا ہے۔ اس کا بڑا شکار عورت ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس ناانصافی، اِس استحصال اور عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ذہن کی یہی فکری سطح تانیثیت کہلاتی ہے۔ اُنھوں نے معاشرے کی اصلی تصویر دکھائی جس میں بے جا پابندیاں، جکڑ بندیاں اور جسمانی، سماجی

اور روحانی استحصال کی لاتعداد داستانیں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ دقیانوسیت کا شکار معاشرہ عورت کی ہر اُس اُڑان پر قدغن لگاتا چلا آیا ہے جس میں اُس کی فہم اور اُس کے ادراک میں روانی ملتی ہے۔ اردو ادب کی تقریباً ہر صنف میں انسانیت کے اس گھِناؤنے عمل کے خلاف لکھا گیا ہے اور یہیں سے نسائی آواز نے تانیثیت کا رُوپ لینا شروع کیا اور معاشرے میں باقاعدہ ایک پیغام کی صورت میں پہنچا، جس سے اصلاح کی شروعات ہوئی۔

احمد ندیم قاسمی نے حقیقت و صداقت کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو افسانے کے پیراہے میں بیان کر کے بیداری کا پیغام دیا، تحقیق کار اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ اُس نے اپنے قلم سے جہاد کرنا ہوتا ہے۔ قلم کار کا قلم اُس کے لیے تلوار ہوتا ہے اور بلاشبہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے قلم سے یہ کام کیا لیکن جدوجہد اور حالات خلاف طبلِ جنگ کا یہ سفر ابھی بھی ادھورا ہے۔ مثبت نتائج کے لیے اُن کے افسانوں میں موجود بلیغ اشاروں سے استفادے کی ضرورت ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی تصویر دکھا کر قاری کو قد آور آئینے کے سامنے کھڑا کیا ہے۔

کوہ پیما:

افسانی مجموعہ "کوہ پیما" ۱۹۹۵ میں اساطیر پبلشرز نے طبع کیا۔ یہ مجموعہ "نیلا پتھر" کے 13 سال بعد منظر عام پر آیا. اتنے طویل وقفے کے بعد افسانوں میں تنوع نظر آتا ہے۔ روایتی موضوعات سے ہٹ کر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں دس افسانے ہیں۔ بَین، کوہ پیما، چُبھن، اخبار نویس، عاجز بندہ، چرواہا، ایک یک لباس آدمی، پیپل والا تالاب، چھلّی ،ٹریکٹر وغیرہ شامل ہیں۔

مندانہ ہے۔ غریبوں کے گھر پر پلنے اور پروان چڑھنے والی جوانی کیاطاقتوروں مخدوموں اور امیروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہوتی ہے۔ کسی صاحب درگاہ سے بے چاری کے امداد کی توقع عبث ہے۔

یہی اس کا مرکزی خیال ہے۔ ڈاکٹر انور احمد :اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مبینہ طور پر صدیوں سے کسی مزار سے احتساب کے نکلنے کا ایک طویل انتظار بھی ایک الم ناک تجربے کی زد میں آکر بیچارگی میں ڈوبے کسی گاؤں یا قصبہ کی سادہ زندگی میں راہ سے مماثل ارتعاش تو کر دے مگر تبدیلی نہ آسکے۔"(۶۵)

افسانے میں بیٹی پیدا ہونے پر جب اس کا باپ اداس نظر آتا ہے تو ماں کہتی ہے:

"تم تو کہتے تھے بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے پھر اب کیوں منہ لٹکا لیاہے اوراور اس نے کہا تھا تو نہیں جانتی نہ بھول عورت تو ماں ہے نا۔تو کیسے جانے کے خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے۔"(۶۶)

ماں کہتی ہے کہ میں ڈر گئی تھی میرے اندر خوف نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور میں نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیے۔واجد متحکم دادی ماں اپنی یاد داشتیں گنگناتے ہوئے کہانی سناتی چلی جاتی ہیں یہ کہانی اپنی بیٹی کی پرورش کے سولہ سال ہیں جن میں وہ اپنی بیٹی کی خوبصورتی،خوب سیرتی کے ساتھ مذہب سے لگاؤاور رغبت کوبیان کرتی ہیں۔ماں باپ کے پاس دین محمد کے بیٹے کا رشتہ آتا ہے۔ابھی وہ اسی ادھیڑپن میں ہے کہ سائیں حضرت شاہ خادم اسے بلانے آتا ہے۔کے سائیں دولھے شاہ کا عرس ہے جو تین دن چلے گا۔سائیں حضرت شاہ نے خواب میں دولہے شاہ کو دیکھا ہے کہ میری چیلی "رانوں" کو بلا کر اس پر تین دن تک اس سے تلاوت کراؤ ورنہ سب کچھ بسم کر دوں گا۔رانوں کو دربار پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تین دن بعد جب والدین رانوں کو لینے پہنچتے ہیں تو ماں جو منظر دیکھتی ہے اس انداز میں بیان کرتی ہے۔

"تین دن کے بعد ہم دونوں سائیں دولھے شاہ کے مزار شریف پر گئے تھے تو ہم وہیں بیٹھیں تھی جہاں ہم تمہیں بیٹھا کر گئے تھے مگر کیا یہ تمہیں تھی تمہاری آنکھوں کی تیلیاں پھیل گی تھی تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی بیڑیاں تھی تمہارے بال الجھ رہے تھے چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر نہیں خیال نہ آیا کہ تمہارا انگ انگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں مجھ سے دور رہو بابا میرے پاس نہ آنا۔"(۶۷)

رانوں جلا کر کہتی ہے کہ میں گھر واپس گھر نہیں جاؤں گی ادھر ہی رہوں گی تب تک جب تک روایت کے مطابق مزار نہیں کھلتا اور انصاف نہیں ہوتا مجھے انصاف ملے گا تو میں گھر جاؤں گی پر اب نہیں۔اب میں بند گی ہوں مر گئی ہوں یہاں کاری پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے قاری کی فکرِزقند کھاتی ہے کہ دراصل کیا ہوا ہو گا لیکن عقیدے میں کمزور لوگ اثر ہو گاہے کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں۔انکی اہ و فریاد کوئی نہیں سنتا کچھ عرصے بعد یہ والدین اپنی بیٹی کو لے کر آتے ہیں وہاں سے چلتے وقت رانو خود کلامی کرتی ہے۔

”کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا چلو ییں،گناہگار ،سہی سائیں دولھے شاہ جی آپ نے تو بڑا انتظار کرایا آب قیامت کے دن ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے“(٦٨)

لڑکی فوت ہو جاتی ہے تو درگاہ سے اس کے لیے کفن آتا ہے۔جسے اس کا باپ آگ میں جھونک دیتا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی کا جن اب باپ پر حاوی ہو گیا ہے۔

ہجرت ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کی تباہی،استحصال،دہشت،عدم،مساوات،نا انصافی اور افتادگی کی داستانیں ہیں۔انہوں نے انسانی حیات کے لیے اندرونی شکست و ریخت اور عورت کی ٹریجڈی کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے کہانی ایک مرتبہ سماج میں اور دوسری مرتبہ کہانی کہنے والے کے اندروقوع پذیر ہوتی ہے۔

افسانہ ”سبیل والا تالاب“ ایک ایسا افسانہ ہے جس میں صنعیف الاعتقادی کا بیان ہے۔سبیل والے تالاب پر بے اولاد عورتیں دعا مانگنے والے جاتی ہیں جن کے نتیجے میں انہیں اولاد ہو جاتی ہے۔یہ ایک الگ موضوع ہے کہ سائیں کالے شاہ مزار شریف کے سامنے تالاب کے کنارے بیٹھ کر بے اولادوں کو اولاد کیسے دیتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں اولاد خالصتان عورت کا مسئلہ سمجھی جاتی ہے۔اگر نہ ہو تو اسے طلاق یا بے دردی کا سامنا کرنا پڑتا ہےیوں تعویز دہاگے اور درگاہ خان گاؤں والے پیر سائیں اور بابا ان کی عصمت دری کرتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ایک افسانہ ”چھلی “ہے۔اس میں ایک پٹھان شہر میں مکئی کے بھٹے بھیجتا ہے وہ اپنی جوان بیٹی کو زمانے کے ڈر سے ساتھ رکھتا ہے۔لیکن میرے لیے کہاں نہیں ہوتے۔وہاں دو لڑکیاں ستارہ اور ررفیہ چاچے ولی

محمد کی بیٹی داری کی دوست بن جاتی ہیں اور روزانہ مچھلی خریدنے کے ساتھ ایک روپیہ اضافی داری کو دے کر جاتی ہیں۔ایک دن داری بتاتی ہے کہ ابا اور آج میں اپنا اڈہ تبدیل کر رہے ہیں اور ولی محمد تفصیل بتاتا ہے:

"دو روز سے دو لفنگے موٹر سائیکل پر سوار آتے ہیں اور مجھ سے میری بیٹی کی قیمت پوچھتے ہیں وہ کہتے ہیں ہمیں وہ مچھلیاں نہیں یہ مچھلی چاہیئے۔میں یہ سارے دیکھتے ہوئے انگارے ان کے منہ پر مارتا پر آپ تو جانتی ہو گی کہ پکڑا بھی میں ہی جاؤں گا ہمیں یہی علاج سوجھا ہے کہ اڈا بدل لوں"۔(٦٩)

ستارہ اور رضیہ تسلی دیتی ہیں اور ان لڑکوں کو پولیس کے ذریعے پکڑا دیتی ہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکے رضیہ اور ستارہ کے بھائی تھے۔

کیونکہ احمد ندیم قاسمی کا اور فنکار ہیں۔ایسا فن کا افسانہ نگار ماحول کی ہر برائی کو اپنے قلم کی رونق بناتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں ظلم و ستم اور ناانصافی کو اپنا موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ غربت افلاس مفلسی استحصال اور انسانی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔